نگار

قیمت ۸؍

نرخنامہ اُجرت اشتہار

ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ - ۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھا صفحہ - ۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۲۵ "	۱۳ "	۷ "	۴ روپیہ

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اسکی عہد بعہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے معہ انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی - اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں۔
حجم ۲۵۶ صفحات - قیمت عہ/ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اسکے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب معہ ترجمہ کے درج ہے - ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے - قیمت علاوہ محصول ۸/

ملنے کا پتہ منیجر نگار

تصانیف نیاز فتحپوری

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ/)
علاوہ محصول۔

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲ افسانے ۳۳ء تک کے درج ہیں - زبان قدرت بیان علو تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا - ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ/)
علاوہ محصول۔
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے - جذبات نگاری، اور سلاست بیان رنگینی اور ادبیت کے لحاظ سے فنِ انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں معہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے
علاوہ محصول۔

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ/)
علاوہ محصول۔

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (سے) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۱) — فہرست مضامین فروری ۱۹۳۷ء — شمار (۲)

ملاحظات		۲
مذہب کی شکست علم کے مقابلہ میں	امام اکبرآبادی	۹
انقلابی		۱۶
سوئٹزرلینڈ کا آئینِ وفاق	ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا	۲۵
بنارس کی بیوہ (افسانہ)	ظہیر الدین حیدر نیر آروی	۳۳
لامذہبیات		۵۱
سائنس کے اکتشافات جدیدہ		۶۰
مکتوبات نیاز		۶۴
باب المراسلۃ والمناظرہ		۶۸
باب الاستفسار		۷۳
مفلس کی دنیا (نظم)	تمکین سرمست	۷۷
محبت کے دو باغی (نظم)	فطرت واسطی	۷۸

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

معاون:- جلیل الرحمان اعظمی

جلد (۳۱)	فروری سنہ ۳۷ء	شمارہ (۲)

ملاحظات

حال و مستقبل

کوہ آتش فشاں کا اندرونی پگھلا ہوا آتشیں مادہ جوش میں آکر دفعتاً باہر نہیں نکلتا۔ جو آبادیاں اس کے دامن میں بستی ہیں وہ جانتی ہیں کہ فطرت کی اس قہرمانی قوت کے ظہور سے قبل کیا کیا علامات رونما ہوتی ہیں۔ پہلے شب کی تنہائیوں میں انھیں گرج کی سی آوازیں سنائی دیتی ہیں، اس کے بعد پہاڑ کی چوٹی سے ہلکا ہلکا دھواں نکلنا شروع ہوتا ہے، پھر وہ زیادہ کثیف ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک سینہ دہلا دینے والی آواز کے ساتھ جابجا زمین شق ہونے لگتی ہے اور آتشیں مادہ ایک عفریت کی طرح بل کھاتا ہوا باہر ابل پڑتا ہے اور چاروں طرف تباہیاں و بربادیاں پھیلا جاتا ہے۔

اس وقت دنیا جس دور سے گزر رہی ہے وہ سیاسی نقطۂ نظر سے بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی جوالا مکھی آتش فشانی کے لئے طیار ہو اور اس کی علامتیں روز بروز زیادہ نمایاں ہوتی جارہی ہوں۔

اس وقت کوئی ملک ایسا نہیں جو امن وسکون کے اعلان میں انتہائی بلند آہنگی سے کام نہ لے رہا ہو لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ پکار جن سینوں سے نکل رہی ہے ان کے اندر کیسا ہیجان برپا ہے اور وہ مایوسی کس قسم کی ہے جو منزل مقصود کے ذکر کے سوا اور کوئی سہارا اپنے پاس نہیں رکھتی۔ گویا پانی نایاب ہے اور صرف اس کا نام لے لیکر پیاس بجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

دنیا میں جب امن وسکون کی اشاعت کا دعوی نہیں کیا جاتا تھا۔ تو وہ بغیر کوشش کے ہمیں حاصل ہوجاتی تھی اور اب کہ زمانہ کو ہر ہر منطق سے اس کا یقین دلایا جارہا ہے۔ اس کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔

اس سے قبل دسمبر کے نگار میں، مسئلۂ فلسطین پر بحث کرتے ہوئے سیاسیات یورپ میں برطانیہ کے پوزیشن کو میں نے واضح کیا تھا اور بتایا تھا کہ جنگ حبش نے یورپ کے سیاسی توازن کو جو غیر معمولی صدمہ پہونچایا ہے اس سے نہایت سخت بے چینی دول مغرب میں پیدا ہوگئی ہے اور اس نے مستقبل کی جنگ کو ہم سے اسقدر قریب تر کر دیا ہے کہ اس کی زہر آلود گیس کی بو ہم کو محسوس ہونے لگی ہے۔

آج کی صحبت میں، مختصراً یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ مغرب کی قومیں ایک دوسری کی طرف دست محبت دراز کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، ان کے دل کی دھڑکن کا کیا عالم ہے اور جنگ کے لئے وہ اندرونی طور پر کیا کیا طیاریاں کر رہی ہیں۔

اس وقت یورپ میں جتنی سلطنتیں پائی جاتی ہیں، ان میں سوائے انگلستان کے سب کے متعلق ہمیں یہ علم حاصل ہے کہ وہ کن اصول پر حکمرانی کرنا چاہتی ہیں، اور ان کا حقیقی مقصود کیا ہے۔ روس ملوکیت وسرمایہ داری دونوں کا دشمن اور (NIHLISM) کا حامی ہے اور فرانس کی اشتراکیت پسندی بھی چھپی ہوئی چیز نہیں اسی طرح جرمنی اور اطالیہ کے متعلق یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ وہ سرمایہ داری کے حامی اور ڈکٹیٹر شپ کے قایل ہیں۔ لیکن برطانیہ عظمی ہی ایک ایسی سلطنت ہے جس کے متعلق ہم کو آجتک نہیں معلوم ہوسکا کہ اسکی حکومت کس نوع کی حکومت ہے اور اس کا منتہائے نظر کیا ہے۔ بادشاہ کا وجود وہاں ضروری، لیکن ملوکیت کا پتہ نہیں، پارلیمنٹ اور نیابت وانتخاب وغیرہ سبھی کچھ موجود مگر جمہوریت کا کہیں نشان نہیں، کابینہ میں صرف وزیر اعظم ایک ایسی ہستی ہے جو تمام نظم ونسق پر حاوی ہے مگر ڈکٹیٹر شپ سے اظہار بیزاری۔ سرمایہ داری پر اسکی تمام طمطراق ارسٹاکریسی قایم، لیکن مزدور جماعت کے ساتھ اظہار ہمدردی کے لئے ہر وقت طیار۔

الغرض حکومت برطانیہ اس وقت تمام دنیا کی سلطنتوں میں بالکل وہی حیثیت رکھتی ہے جو مذہبی دنیا میں "لا ادریت" والوں کی ہے اور اسی لئے یورپ میں جب کوئی جدید سیاسی ہلچل پیدا ہوتی ہے تو برطانیہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کس کا ساتھ دے اور کس کو چھوڑ دے اور اس کو اپنی اس پالیسی کا نباہنا دشوار ہے

جنگ حبش کے دوران میں اس نے چاہا کہ اطالیہ اور حبش دونوں کو خوش رکھ سکے اور نتیجہ اسکے بالکل برعکس یہ نکلا کہ حبش اور بحیرۂ روم دونوں جگہ سے اس کا اقتدار اُٹھ گیا۔

جرمن کے مقابلہ میں برطانیہ بظاہر ہمیشہ فرانس کی طرف مایل رہا لیکن جب وقت جرمنی نے حدودِ فرانس پر ارض ممنوعہ کی طرف قدم بڑھایا تو فرانس کا کوئی احتجاج برطانیہ کی رگ اخوت میں حرکت نہ پیدا کر سکا۔ بالشیوک اُصول سے جو نفرت برطانیہ کو ہے، کسی سے مخفی نہیں لیکن اس سے تجارتی بھائی چارہ قایم کرنے میں اس نے مطلق پس و پیش نہیں کیا۔ الغرض دولِ یوروپ میں برطانیہ کا پوزیشن سب سے نرالا واقع ہوا ہے اور اسی لئے اس سے زیادہ امن و سکون کا خواہاں کسی اور ملک کو نہ ہونا چاہئے، لیکن جب اس کی کوئی توقع باقی نہ رہے تو پھر اس کی مشکلات کا اندازہ بھی مشکل ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم کے بعد آیندہ خطرۂ جنگ کو ضعیف کرنے کے لئے دو چیزیں پیدا کی گئی تھیں۔ ایک لیگ اقوام اور دوسرے اسلحہ بندی کی روک تھام۔ یعنی خاص خاص ملکوں کو ایک خاص حد تک اسلحہ و سامان حرب رکھنے کی اجازت دیجائے اور اگر کوئی نزاع باہمدگر پیدا ہوجائے تو اس کا تصفیہ لیگ کے ذریعہ سے چاہا جائے۔ اگر ان تحریکوں میں تمام سلطنتیں واقعی نیک نیتی سے حصہ لیتیں تو اس میں شک نہیں کہ دنیا کا کھویا ہوا امن و سکون بڑی حد تک دوبارہ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن چونکہ ہر سلطنت اپنے ذاتی مفاد کو پورا کرنا چاہتی تھی اور ٹھیک اسیوقت جبکہ وہ ہاتھ میں "نشترِ فصاد" کی نمایش کر رہی تھی، آستین میں دشنہ لئے ہوئی تھی، اس لئے یہ تحریک مطلق کامیاب نہیں ہوئی۔ پہلی ضرب اس کو جاپان نے پہونچائی اور رہا سہا اقتدار اس کا مسولینی نے مٹا دیا۔

بالکل یہی حال (DISARMAMENT) کی تحریک کا ہوا کسی قوم نے بھی اس کے قایم کردہ حدود کا احترام نہ کیا اور ہر سال طیاری اسلحہ کا بجٹ بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ اب دنیا کی تقریباً وہی حالت ہوگئی ہے جو ۱۹۱۴ء کے جنگ عظیم سے قبل پائی جاتی تھی[1] اور آہستہ آہستہ تمام ممالک اسی نقطہ سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں

---

[1] روس کی سرخ افواج کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تک پہونچگئی ہے کیونکہ بھرتی ہونے کی عمر اکیس سے اُنیس سال کردی گئی ہے۔ اسوقت کم از کم ۵۰۰۰ ہوائی جہاز اس کے پاس ہیں اور دس ہزار ٹینک (دبابہ)۔ جرمنی کی عسکری قوت سات لاکھ سپاہ تک پہونچگئی ہے اور ایک ہزار سے زیادہ جنگی ہوائی جہاز اس کے پاس موجود ہیں اور ۸۰ کرور پونڈ سالانہ اس کا فوجی خرچ ہے۔

فرانس نے چند ماہ کا عرصہ ہوا اپنے فوجی مصارف ۸ اکرور تک بڑھا دئے ہیں۔ اطالیہ کی فوجی قوت کا صحیح علم نہیں ہے لیکن ایک سال قبل مسولینی نے بیان کیا تھا کہ دس لاکھ مسلح سپاہ اس کے پاس موجود ہے۔

جاپان کا فوجی بجٹ ۱۹۳۲ء کے مقابلہ میں اب دو چند ہے اور امریکہ نے اس سال سات کرور بیس لاکھ پونڈ اور زیادہ اپنے فوجی بجٹ میں منظور کئے ہیں۔ اسی طرح برطانیہ کے فوجی مصارف میں پانچ کرور اسّی لاکھ پونڈ کا اضافہ ہوا ہے۔ الغرض اس وقت بہ نسبت ۱۹۱۴ء کے تمام ممالک کا فوجی خرچ پانچ گنا زیادہ ہو گیا ہے۔

جہاں پہونچکر ایک دوسرے سے دست وگریباں ہوجانا ناگزیر ہے۔

اسلحہ وسامان حرب کے متعلق سب سے زیادہ پابندی جرمنی پر عاید کی گئی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی نے سب سے زیادہ اس کی خلاف ورزی کی اور اب نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ یا تو کھلم کھلا اس سے دوستی کے تعلقات قایم کئے جائیں یا پھر "ہمیں میداں، ہمیں چوگاں، ہمیں گو ..." پر عمل کیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ گزشتہ جنگ میں جرمنی کے بہت سے مستعمرات اس کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں، لیکن یہ بھی جرمن قوم کی جرأت وہمت کا اعجاز ہے کہ نچے ہوئے پروبال کی جگہ پھر نئی کلیاں پھوٹ آئیں اور اس میں پہلے سے زیادہ قوتِ پرواز عود کر آئی۔

نہ صرف اندرونِ ملک میں بلکہ ہر جگہ جہاں اس کا قبضہ ہے غیر معمولی حرکت وعمل نظر آتی ہے اور اس نے سب سے زیادہ جس قوم کو مشوش بنا رکھا ہے وہ برطانیہ ہے۔

بحرِ شمال کے سواحل پر (ساحل انگلستان سے صرف ۲۵۰ میل کے فاصلہ سے) جرمنی کے متعدد جزائر پائے جاتے ہیں اور ان میں ہر جگہ ایک بحرانی کیفیت کے ساتھ فوجی طیاریاں عمل میں آرہی ہیں — جزائر JUIST، NORDERNEY اور WANGEROOG میں استحکاماتِ قلعہ بندی اور ہوائی جہازوں کی فرودگاہ بنانے کے لئے لاکھوں ٹن کنکریٹ بچھائی جارہی ہے۔ اسی طرح جزیرہ SYLT میں ڈنمارک کی سرحد تک قلعہ بندیوں کا کام نہایت وسیع پیمانہ پر تکمیل کو پہونچ رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ مقام یوروپ کا سب سے زیادہ وسیع ومستحکم مرکز بحری وہوائی قوت کا بننے والا ہے۔ اسی کے ساتھ جو اور اندرونی طیاریاں تمام آبادی کو اسلحہ بند فوج بنانے کے لئے جاری ہیں اور جس دیوانگی وبیدردی کے ساتھ سامانِ حرب، زہریلی گیس اور ہوائی جہازوں کی طیاری پر روپیہ صرف کیا جارہا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس تاریک و ہولناک مستقبل نے دنیا کو لرزہ بر اندام بنا رکھا تھا وہ اب دور نہیں ہے اور کسے خبر ہے کہ وہ اچانک کس وقت سامنے آجائے۔

جرمنی کے علاوہ یوروپ کے اور ممالک بھی اس آنے والی "قیامت" کا مقابلہ کرنے کے لئے تمام ممکن ذرایع سے کام لے رہے ہیں، چنانچہ روس، فرانس اور اطالیہ کی آمدنی کا سب سے بڑا حصہ جنگ کی طیاریوں ہی میں صرف ہو رہا ہے اور یہی حال مشرق میں جاپان کا ہے۔

دولِ یوروپ میں برطانیہ ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے بجائے اسلحہ کے ہمیشہ اپنی ڈپلومیسی پر زیادہ اعتماد رکھا، لیکن کب تک ہ آخرکار وہ بھی مجبور ہوگیا کہ سیلاب کا رُخ دیکھ کر اپنی رفتار بدل دے، چنانچہ وہاں بھی بحری وہوائی طاقت کو بڑھانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور زہریلی گیس سے بچنے کے لئے نئے نئے انداز کے لباس

دمکان طیار کئے جارہے ہیں۔

یقیناً برطانیہ جنگ مستقبل کے اندیشہ کی طرف سے کبھی بے خبر نہیں رہا لیکن اپنے آپ کو بھاری بھرکم ظاہر کرنے کے لئے وہ کبھی اس کا ذکر زبان پر نہیں لایا، لیکن اب کہ تلوار کی دھار ہڈی تک پہونچتی نظر آرہی ہے، منھ سے چیخ کا نکل جانا ناگزیر ہے اور ہاتھ پاؤں ہلانا لازم۔

مسٹر لائیڈ جارج نے جو تقریر حال ہی میں بہ مقام ناٹنگھم کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت کس خطرۂ عظیم کے مقابلہ کا سوال انگلستان کے سامنے ہے۔

مسٹر لائیڈ جارج نے دوران تقریر میں ظاہر کیا کہ :- "حالت بہت نازک ہے اور نازک تر ہوتی جارہی ہے اور اسی لئے باوجود ضعف و انحطاط کے مجھے باہر نکل آنا پڑا تاکہ اپنی رہی سہی قوت ملک کی خدمت کے لئے وقف کردوں۔ اب وقت صاف صاف کہنے کا ہے اور اس لئے مجھے کہدینا چاہئے کہ جن تلخ حقیقتوں سے اٹلی اور جرمنی کو دوچار ہونا پڑا ہے، انھیں کا مقابلہ ہمیں بھی کرنا ہے اور اگر ہم نے غیر معمولی ہمت و جرأت سے کام نہ لیا تو کامیابی کی کوئی توقع نہیں"۔

اسوقت دول یوروپ میں ایک دوسرے کے ساتھ جو معاہدے ہو رہے ہیں وہ امن و سکون سے زیادہ بدامنی کے امکانات اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ ایک طرف جرمنی اور آسٹریا کا باہمی معاہدہ (جس میں یقیناً اطالیہ بھی شریک ہوگا)، دوسری طرف روس اور زیکوسلوکیا کا۔ تیسری طرف برطانیہ کی یہ کوشش کہ وہ یوروپ کے مختلف سیاسی عناصر سے ساز باز بھی رکھے اور کسی کا ساتھ بھی نہ دے۔ ان سب نے ایسی پیچیدگیاں پیدا کردی ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا آیندہ نقشۂ جنگ کی صورت کیا ہوگی۔ آسٹریا، جرمنی اور اطالیہ اگر خود اپنے ذاتی اغراض کی بنا پر ایک دوسرے سے برسر پیکار نہ ہوئے تو اس میں شک نہیں کہ اشتراکی حکومتوں کے لئے اس میں سخت خطرہ پنہاں ہے اور فرانس مجبور ہوگا کہ وہ روس کے دامن میں پناہ لے۔ لیکن، روس کی معیت جس نے زیکوسلوکیا سے صرف اس لئے معاہدہ کیا ہے کہ جنگ کے وقت اسے اپنی ہوائی طاقت کا مرکز قرار دے، کبھی برطانیہ کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بلقان کی تمام ریاستوں کے اندر بھی اختلاف پیدا ہوگا اور بالکل وہی نقشہ سامنے آجائے گا جو گزشتہ جنگ عظیم کے وقت پیش آیا تھا۔ الغرض یوروپ کا کوئی ملک ایسا باقی نہ رہیگا جو جنگ میں حصہ لینے پر مجبور نہ ہو اور اس طرح عالمگیر ہلاکت و خونریزی بالکل یقینی ہے۔

پھر چونکہ کسی ملک کی آبادی اس کے لئے تو آمادہ نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالے، اس لئے ہر سلطنت اندرونی انقلاب کی طرف سے بھی خائف ہے، اور بالکل ممکن ہے کہ اس طرح تمام دنیا میں اشتراکی لہر دوڑ جائے۔

یہ تو ہوئے وہ حقایق و واقعات جن کی بنا پر آیندہ جنگ کا واقع ہونا لازم خیال کیا جاتا ہے اور جسکی طیاری میں ہر ملک مصروف ہے، لیکن اسی کے ساتھ بعض جماعتیں ایسی بھی ہیں جو ردّ بلا کے امکانات پر غور کر رہی ہیں اور موجودہ سیاسی اُلجھنوں کے اسباب کو سمجھکر ان کے دفع کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ان جماعتوں میں سب سے زیادہ اہم اہل مذہب کی جماعت ہے اور جس نتیجہ پر وہ پہونچی ہے نہایت عجیب و غریب ہے۔

اس کے نزدیک موجودہ اضطراب کا سبب نہ اقتصادی دشواری ہے، نہ تجارتی حرص و طمع، نہ ضرورت سے زیادہ صنعتی پیداوار سے بے چینی پیدا ہوئی ہے نہ اس بات سے کہ آدمیوں کی جگہ مشینوں نے لیکر انھیں بیکار بنادیا ہے، بلکہ اس کا تنہا سبب ان کی رائے میں دہریت و الحاد ہے اور انجیل مقدس کی پیشین گوئی کی بنا پر وہ اس جنگ کو ضروری خیال کرتے ہیں کیونکہ نزولِ مسیح کی یہی علامت انھیں بتائی گئی ہے۔

بہر حال آیندہ جنگ کا سبب مادی ہو یا روحانی، دہریت و الحاد ہو یا نزولِ مسیح، ہے بالکل اٹل اور اس بلا کا ایک بار اور دنیا میں نازل ہونا ضروری ہے، کیونکہ جب تک دنیا سے بلند و پست اور نشیب و فراز کے دھبے نہ مٹیں گے امن و سکون کا دور کبھی نہ آئے گا۔

ایک خاص اطلاع

نگار کے اجرار کو پندرہ سال کا زمانہ گزر چکا ہے اور اس سال سے سولھواں سال شروع ہوتا ہے۔ اس دوران میں تقریباً پندرہ ہزار صفحات، قارئین نگار کے سامنے پیش کئے گئے۔ اور اگر آپ پورے فایل کو دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں نصف سے زاید صفحات میرے دماغ و قلم کا نتیجہ ہیں۔ یقیناً یہ کوئی معجزۂ ادب و انشا نہیں ہے اور دنیا میں متعدد ہستیاں ایسی موجود ہیں جو اس سے زیادہ طویل فردِ عمل اپنے پاس رکھتی ہیں، لیکن شاید اس سے انکار ممکن نہ ہو کہ عمر و زمانہ کے مقابلہ میں کبھی نہ کبھی انسان کو سپر ڈال دینا ہی پڑتی ہے اور قوا کا اضمحلال نسبتاً زیادہ آرام و سکون چاہتا ہے۔

ہر چند بحمد اللہ ابھی تک نہ مجھے اپنے قوا ظاہری سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہے، نہ دل و دماغ ادائے فرض سے قاصر نظر آتے ہیں، لیکن بہر حال اسوقت کا آنا ناگزیر ہے جب یہ سب کچھ ہو کر رہیگا اور ایک ایسے شخص کی ضرورت نگار کو ہوگی جو اس کی قایم کردہ روایات کو پیش نظر رکھکر اُسے کامیابی کے ساتھ چلا سکے۔

چنانچہ کچھ عرصہ ہوا میں نے اعلان کیا تھا کہ اگر کوئی صاحب میرے ساتھ کام کرنے کے لئے آمادہ ہوں تو اطلاع دیں۔ اس کے جواب میں متعدد حضرات نے اپنی خدمات پیش کیں، لیکن جو خصوصیات میں چاہتا تھا وہ کسی ایک میں بھی نہ تھیں۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں مولوی جلیل الرحمان صاحب اعظمی سے ملاقات ہوگئی اور ان کے اکتسابات علمیہ و رجحانات ذہنی میں بہت سے "امکانات" مجھے نظر آئے۔

اعظمی صاحب عربی و فارسی کے فاضل ہیں اور ان دونوں زبانوں میں ماہرانہ و ادیبانہ نظر رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ صحافت کے لئے جس خاص ذوق کی ضرورت ہے وہ بھی ان میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ اس لئے میں اسے فال نیک سمجھتا ہوں کہ نگار کو ان کی خدمات حاصل ہو گئی ہیں اور اس طرح اب میں بعض ان اہم تصانیف کی طرف متوجہ ہو سکوں گا، جو عرصہ سے میرے پیش نظر ہیں اور جن کی تکمیل کی فرصت مجھے نصیب نہ تھی۔

ہر چند اعظمی صاحب "مذہبیات" کے باب میں میرے ہمنوا نہیں ہیں تاہم آزادی کے ساتھ سوچنے کا میلان ان میں پایا جاتا ہے اور ممکن ہے کہ کسی وقت وہ بھی اسی نتیجہ پر پہونچیں جو میرے سامنے ہے۔ بہر حال جب تک وہ میرے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے طیار نہ ہوں نگار کے اس حصہ سے انھیں کوئی واسطہ نہ ہوگا اور تمام اس نوع کے مباحث خواہ وہ ملاحظات میں درج کئے جائیں یا باب المراسلہ و باب الاستفسار میں میرے ہی قلم سے ہوا کریں گے۔

باب الانتقاد کو میں زیادہ وسیع کرنا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ اس مقصد کی تکمیل میں مجھے ان سے زیادہ مدد ملیگی۔ اسی کے ساتھ وہ علمی و ادبی مضامین بھی لکھیں گے اور بہت سے چھوٹے کاموں میں میرا ہاتھ بٹائیں گے۔

اعظمی صاحب کے جتنے مقالے ہوں گے وہ انھیں کے نام سے شایع ہوں گے، اور جو میرے قلم سے ہوں گے ان پر حسب دستور سابق کسی کا نام نہ ہوگا۔

آیندہ ماہ میں شواعر العرب کے عنوان سے ان کا ایک ادبی مقالہ شایع ہوگا اور اس کے بعد بھی ہر مہینے ان کے مفید و دلچسپ مضامین نگار میں درج ہوتے رہیں گے۔

سُنّی علماء کرام سے

جنوری ۱۹۳۶ء کے نگار میں جو مقالہ مسئلہ خلافت و امامت پر شایع ہوا ہے وہ شیعی نقطۂ نظر سے ایسا صاف و روشن مقالہ ہے کہ اگر اسکو سامنے رکھکر جواب دینے کی کوشش کی جائے تو بہت سی اُلجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ اس بحث کو میں نے جس پہلو سے اٹھایا ہے اور جس مخصوص انداز کے دلایل پیش کرنیکی پابندی میں نے عاید کی ہے اس نے گفتگو کی نوعیت کو بالکل بدل دیا ہے۔

اب نتیجہ تک پہونچنے کے لئے صرف ایک منزل درمیان کی اور باقی رہگئی ہے یعنی یہ کہ سنی علماء کرام جنوری کے مضمون کو سامنے رکھکر اپنی تحقیقات پیش کریں ـــ میں خود اسوقت تک کچھ نہیں لکھنا چاہتا جب تک فریق ثانی کو اظہار خیال کا موقعہ نہ دیا جائے، اس لئے امید ہے کہ جن حضرات کو اس مقالہ کی موافقت یا مخالفت کرنا ہے وہ جلد توجہ فرمائیں تاکہ جولائی تک مجھے بھی اظہار خیال کا موقعہ مل سکے۔

مذہب کی شکست علم کے مقابلہ میں

تاریخ مذہب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب کا وجود بہت کچھ ماحول اور اقوام عالم کے امیال و عواطف سے متعلق رہا ہے، کوئی چاند سورج کو پوجنے لگا کوئی آب و آتش کو۔ کوئی دیوتاؤں کے روبرو سربسجود ہوا، اور کوئی سنگین مجسموں کے روبرو۔ کوئی مافوق الفطرت شے کے روبرو جھک گیا، اور کوئی غیر معمولی شخصیت کے روبرو۔ پھر چونکہ ہر گروہ کا یہ عقیدہ تھا کہ صرف میری ہی عبادت کا طریقہ صحیح ہے، اس لئے ہر مذہب کا پیرو اپنی اپنی طرف مختلف طریقوں سے انسانوں کو کھینچنے لگا۔ لالچ کے ذریعہ، قید و بند کے ذریعہ، قتل و خونریزی کے ذریعہ، غرضکہ دھوکے و فریب کا کوئی پہلو، جہالت و قساوت کا کوئی طریقہ ایسا نہ تھا جس کے ذریعہ اپنے اپنے حلقۂ عقیدت کی توسیع اشاعت میں بقدر ہمت حصہ نہ لیا ہو۔ یہاں تک کہ اسی حیلے سے انسانوں نے اپنی اپنی وسیع سلطنتیں قایم کر لیں۔ نیز یہ عقیدہ کے اس خیال میں کہ جس قدر انسانوں کو ہم اپنے مذہب کا پیرو بنالیں گے، اسی قدر ہمارا دیوتا یا خدا ہم سے خوش ہوگا۔ بے شمار انسانوں کا خون بہایا گیا اور بہایا جاتا ہے۔ اور دنیا اور اہل دنیا ہزارہا سال سے انہیں آلام و مصائب میں مبتلا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسی کا نام حق و صداقت ہے۔

اس اختلاف شدید نے ایسا گروہ پیدا کردیا، جو کہنے لگا کہ دنیا میں بذات خود نہ تو کوئی حق ہے نہ باطل نہ نیکی کا کوئی وجود ہے، نہ بدی کا، بلکہ یہ سب انسانوں کے قایم کردہ حدود ہیں، جو قابل اعتماد لایق وثوق نہیں۔ نیز یہ کہ یہ تمام باتیں اعتبارات کے تحت میں ہیں۔

چنانچہ ارسطو نے ایک کلیہ قایم کیا جو نہایت پُرشکوہ معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ:-

"تماشہ گاہِ فطرت میں جو مختلف صورتیں نظر آتی ہیں، یہ حالات و کیفیاتِ موجودہ کی تابع ہیں۔ اگر حالات و کیفیات بدل جائیں تو صورت و شکل میں بھی تبدیلی ہوجائے یعنی ہستی کا ایک غیر منقطع سلسلہ ہے جو نباتات و حیوانات سے ہوتا ہوا انسان تک پہونچتا ہے، اور موالید کی مختلف جاتیں ایک دوسرے میں بتدریج اس طرح ضم ہوتی چلی جاتی ہیں کہ انضمام تک محسوس نہیں ہوتا۔

اس کے اس فلسفہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات کا جو یہ غیر منقطع سلسلہ قایم ہے، اس پر کوئی قادر نہیں بلکہ

یہ از خود پایا جاتا ہے، اور اس لئے مذہب کا وجود توہم پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔

زینو ایتھنز کا ایک نامور حکیم جو قبرس یا فنیشیا سے یونان کے پایہ تخت میں آکر رہنے لگا تھا، اسکا فلسفہ یہ تھا:-

"جس طرح ہمیشہ آبشار کی ایک ہی صورت رہتی ہے، لیکن جس پانی سے یہ مرکب ہے وہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اسی طرح قدرت کی نمود سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ مادہ کا ایک سیل ہے جو ہر وقت و ہر لحظہ بہتا رہتا ہے، اور اسی لئے کائنات بحیثیت مجموعی ناقابل تغیر ہے۔ ہمیں یقین کر لینا چاہئے کہ ایک غیر مرئی جوہر کے وجود میں کلام نہیں مگر اس میں کلام ہے کہ ایک ایسا شخصی یا ذاتی خدا موجود ہے جو انسانی صورت رکھتا ہے، اور جو جذبات سے لبریز ہے وحی و الہام کی وقعت ایک ڈھکوسلے سے زیادہ نہیں۔ جس شے کو انسان اتفاق یا حادثہ سے تعبیر کرتا ہے، اسے ایک غیر معلوم علت کا معلول سمجھنا چاہئے۔ کائنات ایک بہت بڑی کل ہے جو خود بخود چل رہی ہے اور نظام کی رگ و پے میں جو طاقت جاری و ساری ہے جہلا اسے خدا کہتے ہیں۔"

امپیڈاکلیز کی رائے ہے کہ ممکن ہے کہ تمام فلسفہ اور مذاہب ناقابل اعتبار ہوں کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسا معیار نہیں جس سے ہم ان کی جانچ کر سکیں۔

ڈی مقراطیس کہتا ہے کہ "حقائق بھی ہمارے ذہن میں تیقن کا القا نہیں کر سکتے۔"

فیرو کی رائے ہے کہ "چونکہ ہمارے پاس حق و باطل کا کوئی معیار نہیں، اس لئے ہمیں ہر شے کی نسبت کے اظہار رائے میں تامل کرنا چاہئے۔"

زنوفینز کا دعوے ہے کہ "ناممکن ہے کہ ہم حق بات کا بھی یقینی تصور کر سکیں۔"

پارمینائیڈیز کا قول ہے کہ "انسان کی دماغی ساخت ہی ایسی نہیں کہ وہ حق مطلق کی تحقیق کر سکے۔ چنانچہ اس فلسفہ سے جماعت تشکیکین کی بنا پڑ گئی، اور خیال کیا جانے لگا کہ ہم کوئی دعوے نہیں کرتے۔ بلکہ یہ دعویٰ بھی نہیں کرتے کہ ہم کوئی دعوے کرتے ہیں۔

اپیکورس اپنے شاگردوں کو یہ سبق دیا کرتا تھا کہ حق کا انکشاف ہرگز عقل کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔

ارسٹیپلیس کو معلومات حسیہ و عقلیہ دونوں سے انکار تھا۔

ارسطو نے اپنے شاگردوں کو یہ تعلیم دی کہ "ادراک اور شے مدرکہ میں ایک قسم کا باہمی تعلق ہے، جس کا اثر انسان کے نظام عصبی پر مترتب ہوتا ہے۔"

انکساغورث فرط حسرت و تاسف سے کہتا ہے کہ کوئی چیز یقینی نہیں ہو سکتی، کسی حقیقت کے چہرے سے پردہ نہیں اٹھ سکتا، کوئی امر یقینی نہیں ہو سکتا، قوائے حسیہ محدود ہیں، قوائے عقلیہ کمزور ہیں، اور حیات مستعار قلیل ہے۔

غرضکہ یونانی فلسفہ جس نتیجہ پر پہونچا وہ یہ تھا کہ انسانی حواس کی شہادت ناقابل اعتبار ہے، اس لئے ہم حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے۔ ان خیالات کی نشر و اشاعت نے ملک میں آگ لگا دی، اور تشکیکین کا ایک علحدہ مذہب قایم ہو گیا۔

برخلاف اسکے مذہبی فلاسفروں کی ایک جماعت نے جو مسیحی علم کلام کی بانی تھی۔ ایک جدید مذہب "فلسفہ اشراقیہ جدیدہ" کے نام سے اسکندریہ میں قایم کیا۔ اس مذہب کا مدعا یہ تھا کہ ایمان و عقل میں توافق پیدا کیا جائے۔ خدا کی ہستی کا تعقل چونکہ افلاطون کے کلیات عقلی کی وساطت سے ناممکن تھا، لہذا فلسفہ اشراقیہ جدیدہ کے بانیوں نے مکاشفے کے مسئلہ کو رواج دیا۔ یعنی حصول علم خارجی اشیاء کے ادراک سے ناممکن ہے، البتہ یہ انجلاء نفس و تزکیہ باطن سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس زمانہ میں مسیحی دنیا کے بڑے بڑے حکما و فلاسفہ اس نکتے کے حل کرنے میں منہمک تھے کہ نظم عالم کس طرح اور کیونکر چل رہا ہے؟

غرضکہ ایک طرف مذہب عیسوی میں توہم پرستی کا زور تھا، اور دوسری طرف فلسفیانہ عقائد کی نشر و اشاعت کا غلبہ۔ قسیسی مورخین کا بیان ہے کہ دوسری صدی عیسوی کے آغاز کے ساتھ ایمان و عقل اور مذہب و فلسفے میں جنگ چھڑ گئی۔ ان اختلافات کے اندفاع اور احقاق حق کی غرض سے مجالس مشاورت کا انعقاد ہونے لگا، جنہوں نے بالآخر مجالس عمومیہ کی شکل اختیار کر لی۔

چوتھی صدی عیسوی میں جب مسیحیت مسند شہنشاہی پر جلوہ افروز ہوئی تو ان مجالس کے احکام کی تعمیل لازمی و ضروری ہو گئی، اور احکام کا نفاذ بزور شمشیر ہونے لگا۔ اس سے کلیسا کا زور بڑھ گیا۔ مشیم مشہور مورخ لکھتا ہے کہ اس زمانے میں قسیسی عہدوں پر جاہلوں اور عامیوں کے مامور ہونے میں کوئی چیز مانع نہ ہوتی تھی۔ وحشی و بے علم جماعت جو علم و فلسفے کی دشمن تھی مجالس مندرجہ صدر کی گویا مالک تھی، اور جو چاہتی تھی وہ کر گزرتی تھی۔ یہاں تک کہ اگر مذہب کو جھوٹ بولنے سے یا دغا و فریب کرنے سے کوئی فائدہ ہو سکتا تھا تو اس حال میں بھی سب کچھ جائز تھا۔

اسی کے ساتھ ایسی عدالتیں بھی قایم ہو چکی تھیں جو ملزم کے خطاوار یا بے خطا ہونے کا فیصلہ انواع و اقسام کی جسمانی ایذاؤں کے ذریعہ سے کرتی تھیں، اور اس فیصلہ کو منجانب اللہ سمجھا جاتا تھا۔ چھ سو سال تک ان عدالتوں کے معیار حق سمجھنے کا یہ طریقہ رہا کہ ملزم کو آگ میں ڈالکر تحقیق کیا جاتا تھا کہ یہ گنہگار ہے یا بیگناہ؟ یا پھر اس کو تالاب میں ڈالدیا جاتا تھا کہ اگر یہ قصوروار ہے تو ڈوب جائے گا ورنہ بچ رہیگا۔ یا پھر لوہے کی سرخ دہکتی ہوئی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں دیجاتی تھی کہ وہ اس سے بچتا ہے یا نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیرھویں صدی عیسوی سے چاروں طرف بداعتقادی کی ہوا چلنے لگی۔ یہاں تک کہ

صرف ایک کثیر گروہ اس امر پر متفق ہوگیا کہ جس چیز کا نام مذہب ہے وہ صرف اغلاط و اوہام کا مجموعہ ہے۔ جب اس محکمہ نے ہوا کا رُخ پھر بدلتے دیکھا۔ اس نے ملاحدہ و زنادقہ کی چپے چپے اور گوشہ گوشہ میں سراغ رسانی کرا کے ایسی وحشیانہ مستعدی ظاہر کی کہ چند سال کے اندر تین لاکھ چالیس ہزار اشخاص کو مختلف سزائیں دیں، جن میں سے بتیس ہزار نفوس کو زندہ جلا دیا۔ اس مجلس تعذیب نے یہ سب کچھ حکومت برقرار رکھنے کے لئے کیا تھا۔

چوتھی لٹرن کونسل منعقدہ ۱۲۱۵ء کے فیصلہ نے اس محکمے کے اقتدار میں ایک اور خوفناک اضافہ کر دیا۔ وہ یہ کہ ہر شخص اپنی پوشیدہ سی پوشیدہ بات اور اپنے تمام افعال و اعمال کا اعتراف اپنے حلقے کے پادری کے روبرو کیا کرے۔ چنانچہ حلقے کے پادری کو اب یہ قدرت حاصل ہوگئی کہ خاوند و بیوی آقا و ملازم کے خانگی راز بھی معلوم کر لیتا تھا۔ اس سے جاسوسی کا ایک اچھا خاصا محکمہ قایم ہوگیا۔ اور اس آڑ میں معصوم و خاطی ہر شخص کو طرح طرح کی ایذا پہونچائی جانے لگی۔ اس سے عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ قانون جو نافذ ہے، مذہبی قانون نہیں ہو سکتا۔ اور یقیناً کلیسا پاکیزگی و تقدس سے منزلوں دور ہو گیا ہے۔ اس گروہ نے تذکرۂ غفران کی فروخت کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی اور تذکرۃ الغفران سے مراد یہ عقیدہ تھا کہ مسیح کے خون کا ایک قطرہ کل بنی نوع انسان کی نجات کے لئے کافی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ کہ جس قدر خون باغ میں اور صلیب پر گرا تھا وہ پاپائے رومہ کو ترکے میں ملا ہے۔ تاکہ اس نجات کی روشنائی سے تذکرۃ الغفران لکھے۔ معصیت پر خط عفو کھینچنے کے لئے مغفرت کا یہ نسخہ فروخت کیا جاتا تھا۔ بعض ان تبرکات کو لوگوں کے سامنے پیش کر کے لوگوں کو بوسہ دینے پر مجبور کرتے تھے اور پھر ان سے روپیہ وصول کیا کرتے تھے بعض اشتہاری پروپیگنڈا کر کے زر کثیر حاصل کرتے تھے۔ غرضکہ طرح طرح سے لوگوں کو اس واہمہ پرستی کی طرف مایل کیا جاتا تھا اور جو کوئی اس کے خلاف آواز اٹھاتا تھا تو اس کا سر کچل دیا جاتا تھا چنانچہ بہ یک وقت دو دو ہزار اشخاص کو زندہ جلا دیا گیا۔ حبس دوام کی سزاؤں اور شکنجے کی ایذاؤں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔

لارنٹ جو انکویزیشن کا مورخ تھا، لکھتا ہے کہ ٹارکوئی میڈا اور اس کے شرکاء نے اٹھارہ سال کی مدت میں دس ہزار دو سو بیس اشخاص کو زندہ جلایا۔ چھ ہزار آٹھ سو ساٹھ اشخاص کی مورتیں بنا کر جلائیں۔ اور ستانوے ہزار تین سو اکیس اشخاص کو مختلف سزائیں دیں۔ نیز چھ ہزار قیمتی و کار آمد کتابوں میں آگ لگا دی۔ اکثروں کو ملک بدر کر دیا۔ اور بہتوں کو جبراً عیسائی بنایا گیا۔ جنھوں نے انکار کیا ان کو سزائے موت دیگئی۔ یہودیوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ ان کو جلاوطن کیا گیا۔ بہت سے یہودی اٹلی، افریقہ، اور ٹرکی چلے گئے۔ اور اکثر بے یار و مددگار خوف کی وجہ سے ادھر اُدھر مارے مارے پھرنے لگے۔ غرضکہ نوع انسانی پر وہ وہ بلائیں نازل کی گئیں جن کا بیان کلیجوں کے ٹکڑے اُڑا دیتا ہے۔

حضرت مسیح کی ولادت سے چار سو سال قبل یونان علم و حکمت کی طرف مایل تھا۔ اور قدیم مذہب کے خیالات ان کے دلوں سے محو ہو رہے تھے۔ فلاسفہ نے جب ماہیت کائنات پر غور کیا تو قوانین فطرت کے مقابلہ میں اولمپس کے دیوتا انھیں حقیر و ذلیل نظر آنے لگے۔

قدیم روایات جو قرنہا قرن سے رائج چلی آتی تھیں اور جن کی صداقت خوش عقیدہ لوگوں کے لئے اصول موضوعہ کا حکم رکھتی تھی عجیب و غریب تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ جزائر بحر روم عجائبات سے آباد ہیں۔ یعنی وہاں جادوگر جادوگرنیاں، دیو، بھوت، چڑیلیں، پردار سانپ، نصف انسان اور نصف گھوڑے کا دھڑ رکھنے والی بلائیں اور یک چشم عفریت آباد ہیں۔ آسمان کی لاجوردی محراب کے متعلق عام خیال تھا کہ یہ بہشت کا صحن ہے۔ جس میں سب سے بڑا دیوتا جوپٹر دوسرے دیوتاؤں اور ان کی بیویوں کے حلقے میں دربار کرتا ہے۔ اور آسمانی آبادی جذبات بہیمہ و اعمال سئیہ میں انسانوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ جب یونانیوں کو جہاز رانی، جغرافی انکشافات اور ممالک غیر میں نئی آبادیاں قایم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور ان کے جہاز بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم نیز ان کے قرب و جوار کے سمندروں کا گشت کرنے لگے۔ تو انھیں معلوم ہوا کہ یہاں تو کوئی عجیب الخلقت چیز موجود نہیں ہے، اور جب زیادہ تجسس سے کام لیا گیا تو اولمپس کا سرے سے وجود ہی نہ ملا۔ مگر محکمۂ احتساب عقاید نے ان متشککین کے شبہات پر لا مذہبیت کا فتویٰ لگایا۔ ان کا مال ضبط کر لیا، اور ان کو جلا وطن کر دیا۔ کیونکہ مذہبی گروہ کا یہ دعویٰ تھا کہ جن باتوں کو لوگ ہزارہا برس سے مانتے چلے آتے ہیں وہ غلط نہیں ہو سکتیں۔ لیکن جب مخالف شہادت اس قدر زبردست ہو گئی کہ جس کا جواب مذہبی لوگوں کے پاس نہ تھا تو ان کے خیالات میں بھی تزلزل پیدا ہونے لگا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان جب عقیدے کا پابند ہوتا ہے، تو اول اول اس کو حرمت کی نظر سے دیکھتا ہے، مگر اس کے بعد جب انسانی دماغ کچھ ترقی پذیر ہوتا ہے تو اس میں شبہات و شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں اس کے بعد تاویل کا دور آتا ہے، اور پھر انکار کا۔ چنانچہ فلاسفہ و مورخین کے ساتھ ساتھ شعرا و انشا پردازوں کے خیالات بھی تبدیل ہونے لگے۔ یورپیڈیز پر فاسد العقیدہ ہونے کا الزام لگایا گیا۔ یہ ڈرامہ نویس تھا اور ہر مضمون کا خاتمہ حسرت و یاس پر کیا کرتا تھا۔ یہ فلسفہ و طبیعیات میں کافی مہارت رکھتا تھا۔ اسے شاعری سے بھی کافی دلچسپی تھی اور یہ ارسطو کے زمرۂ احباب میں سمجھا جاتا تھا۔

اسقلس کفر بکنے کی پاداش میں سنگسار ہوتے ہوتے بچ گیا۔ یہ بھی ایک مشہور و معروف ڈراما نویس تھا یہ بعض جنگوں میں بھی شریک کیا گیا تھا، اور اغلباً اس کی شرکت اس لئے ضروری سمجھی جاتی تھی کہ اس کی طرز نگارش نہایت زود اثر تھی۔ الغرض اس عقلی ہلچل کے آثار ادب و انشا کے ہر شعبے میں نظر آنے لگے۔ اور اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ محسوس کرنے لگے کہ انسانوں کے پاس حق و صداقت اور نیکی و بدی کا کوئی معیار نہیں۔ ایک بات

جو ایک ملک میں اچھی سمجھی جاتی ہے وہی بات دوسرے ملک میں بُری خیال کی جاتی ہے گویا اچھائی برائی محض اعتباری چیز ہے - اب یونان کی حالت بالکل بدل گئی، اور ان کی آزاد خیالی پولٹیکل معاملات میں بھی حصہ لینے لگی اور آئے دن کی خانہ جنگیوں سے یونان تباہ ہونے لگا - ایرانی رشوت کی قربان گاہ پر یونانی مقاصد کی قربانی کی جانے لگی - یونان کا جو حصہ یورپ میں واقع تھا اس نے تو ایران کا باجگزار بننے سے انکار کردیا لیکن ایشائی یونان اس کا حلقہ بگوش ہوگیا - ایران یورپین یونان کو ہمیشہ ذلت کی نظر سے دیکھتا تھا لیکن جب کبھی ایران نے یونان پر فوج کشی کی ہمیشہ شکست ہوئی - اس لئے کہ یونان کا یورپین حصہ نہایت جنگجو و بہادر تھا - اس لئے ہرچند ایران اپنی دولت کے ذریعہ سے ایشائی یونان کو گرویدہ کرچکا تھا، لیکن سکندر یونانی کی جرأت کا وہ حریف نہ بن سکا یہاں تک کہ کل ایشیائے کوچک مع بے شمار خزانوں کے سکندر کے قبضہ میں آگیا اور اس طرح یونانیوں کی دماغی ترقی میں ایک اور اضافہ ہوگیا - انھوں نے بابل کی شہر پناہ کو دیکھا جس کا دور ساٹھ میل سے زیادہ تھا، اور جو باوجود تین صدیاں گزر جانے کے ابھی تک قایم تھی - بعل بک کے سر بفلک مندر کے کھنڈر دیکھے جو زبانِ حال سے پکار پکار کر اپنی گزشتہ شان و عظمت کا حال بیان کررہے تھے - وہ رصد گاہ دیکھی جس میں کالڈیہ کے اختر شمار ہیئت داں راتوں کو بیٹھ کر عالم بالا کی روشن و تابناک ہستیوں سے ہمکلام ہوا کرتے تھے - معلق باغات کو دیکھا - اور اُن کلوں کو دیکھا جن کے ذریعہ ان میں پانی پہونچایا جاتا تھا غرضکہ دنیائے ایشیا کے عجائبات دیکھ کر یونانی سائنس کو بہت تقویت پہونچی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اسکندر نے جو شہر اپنے نام سے بسایا وہ آگے چلکر علوم و فنون کا مرکز بن گیا اور علمی تحقیق کا سمندر موجیں مارنے لگا -

ارشمیدس نے کرہ اور استوانہ کی ماہیت پر کتابیں لکھیں - زینو نے حقیقتِ مطلق کے ادراک کی تشکیک پر بہت کچھ لکھا - اقلیدس نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف سے، دنیا میں ہنگامہ بپا کردیا اس نے نہ صرف ریاضی کی شاخوں پر لکھا، بلکہ علم الاصوات، اور علم مناظر و سراپا پر بھی بعض رسائل لکھے - پانی پر تیرتی ہوئی اشیا کے توازن سے مرکز ثقل پر بحث کی - ایک آتشی شیشہ ایجاد کیا جس سے سایر اکیوز کے محاصرے میں اس نے اہل روما کے جہازوں کا بیڑہ جلا دیا -

ان تمام علمی ترقیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کے عقائد کافور ہونے لگے - اولمپس کی پراسرار چوٹیوں سے دیوتا غائب ہوگئے - ہیڈیز کے خوفناک نظاروں کا نقش پردۂ تصور سے محو ہونے لگا - ایشیائے کوچک کے سبز صحراؤں، سایہ دار نشیمنوں، اور بہتے ہوئے دریاؤں سے دیوتا اور دیویاں رخصت ہونے لگے - روایات الہام کا اثر مٹ گیا - یورپین علم الاصنام کے افسانے - ایشیائی الہامات کی روایتیں، مصری کاہنوں کے قدیم عقائد ایک ایک کرکے مٹ گئے - اسوقت تک مذہب کے ذریعہ سے جو معلومات انسان کو حاصل ہوئیں یہ تھیں کہ خدا نے قوم

ایک نہایت شاندار قوی الجثہ انسان کے مشابہ ہے۔ زمین مسطح ہے جس پر آسمان ایک شاندار گنبد کی طرح قایم ہے، یا بقول سینٹ اگسٹائن جھلی کی طرح کھنچا ہوا ہے۔ آسمان پر چاند، سورج اور ستارے اس غرض سے متحرک ہیں کہ انسانوں کو شبانہ روز روشنی پہونچتی رہے۔ زمین اس مادہ سے جسے خدا نے عدم سے پیدا کیا، مع ان تمام حیوانات و نباتات کے جو اسپر آباد ہیں چھ دن میں تیار ہوئی۔ بہشت آسمان کے اوپر ہے، اور دوزخ زمین کے نیچے ہے۔ زمین مرکزِ کائنات ہے۔ اور باقی تمام اجسام فلکی و غیر فلکی اس کے تابع ہیں۔ انسان کو زمین کی خاک سے بنایا گیا ہے۔ اول اول وہ تنہا تھا، مگر بعد میں اس کی ایک پسلی سے عورت کو بنایا۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ مگر فردوس میں شجر ممنوعہ کھا کر اس نے خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس بنا پر اسے محنت و مشقت اور موت کی سزا دی۔ مگر آدم کی اولاد کو اس سے کچھ عبرت نہ ہوئی، اس لئے خدا نے مجبوراً اس کے تباہ کر دینے کا ارادہ کیا۔ اور پانی کے ایک طوفان عظیم کے ذریعہ سے جس میں پہاڑ تک غرق ہو گئے انسانوں کو ڈبو دیا۔ جب یہ طوفان سب کو غارت کر چکا تو ایک ہوائے تند چلی جس سے پانی خشک ہو گیا۔ اس آفت سے حضرت نوح اور ان کے تین بیٹے ہام سام اور یافث مع اپنی بیویوں کے کشتی میں سوار ہو کر بچ گئے۔ ان میں سے سام نے ایشیا کو آباد کیا ہام نے افریقہ کو اور یافث نے یورپ کو۔ چونکہ امریکہ کی حقیقت پادری صاحبان کے الہام ربانی میں کچھ نہ تھی، اس لئے وہاں کے متعلق کچھ نہ کہہ سکے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدات علمی کے مقابلہ میں ان روایات کو دنیا کس طرح تسلیم کر سکتی تھی، آخر کار مذہب کو علم کے سامنے شکست کھانا پڑی اور رفتہ رفتہ اسکی جگہ عقل نے لیلی۔

امام اکبر آبادی

مکتوبات نیاز

ادب و انشار کی دنیا میں وہ چیز جس کی مثال آپ کو اردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی۔ طنزیات و محاکات شوخی و رنگینی سلاست و بیساختہ پن، لطیف و پاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی و طرز ادا کی ندرت اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو صرف "مکتوبات نیاز" میں نظر آئیں گی۔ اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کا بلاک بھی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات، کاغذ دبیز قیمت معہ محصول ۶ مہ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

انقلابی

ماسٹر گبرائیل اینڈرسن اسکول کے باغ کے کنارہ تک گیا اور وہاں پہونچکر سوچنے لگا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیئے دور، فاصلہ پر، دو میل کے قریب، خالص برفیلے کھیت پر درختوں کی شاخیں اس طرح لٹک رہی تھیں جیسے کسی سفید چادر میں نیلی لیس ٹانک دی گئی ہو۔ دن بہت خوشگوار تھا۔ سفید زمین اور باغ کے لوہے کے جنگلہ کی سلاخوں پر ہر جگہ رنگ ہی رنگ نظر آتا تھا۔ ہوا میں وہ ہلکا پن تھا جو صرف موسم بہار میں پایا جاتا ہے۔ اینڈرسن نے جنگل میں چہل قدمی کے لئے اپنے قدم اُس نیلی لیس کی طرف موڑ دئے۔

"میری زندگی میں دوسری بہار" ۔ اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے اور اپنے چشمہ کے شیشوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اینڈرسن کی طبیعت میں جذباتی شاعری پائی جاتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ پشت پر کئے ہوئے اور چھڑی کو ہلاتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔

وہ چند ہی قدم چلا ہوگا کہ اُسے باغ کے دوسری طرف سڑک پر سواروں کی ایک جماعت دکھائی پڑی۔ ان کی بھوری سیاہی مائل وردی سفید برف میں بالکل الگ نظر آ رہی تھی۔ اینڈرسن بہت متعجب تھا کہ یہ لوگ وہاں کیا کر رہے ہیں کہ یکایک ان کا مقصد اُس کی سمجھ میں آگیا۔ وہ کسی مکروہ کام کے لئے نکلے ہیں، یہ خیال کسی خاص بنا پر نہیں بلکہ ایک اندرونی تحریک سے اُس کے دل میں آیا۔ کوئی غیر معمولی اور اہم واقعہ ہونے والا ہے اور اسی تحریک نے اُسے مجبور کیا کہ وہ سپاہیوں سے پوشیدہ ہو جائے۔ وہ جلدی سے بائیں طرف گھوما، گھٹنوں کے بل جھکا اور برف پر رینگتا ہوا ایک گھاس کے گٹھے تک پہونچ گیا جس کے پیچھے سے وہ اپنی گردن اُٹھا اُٹھا کر یہ دیکھ سکتا تھا کہ سپاہی کیا کر رہے ہیں۔

سپاہی تعداد میں بارہ تھے۔ ان کا افسر ایک جوان آدمی تھا جو خاکی لبادہ پہنے ہوئے تھا اور کمر میں ایک روپہلی پیٹی لگی تھی۔ اُس کا منھ اتنا سُرخ تھا کہ اینڈرسن نے دور سے اُس کی آگے نکلی ہوئی مونچھوں اور ابروؤں کی سفیدی مائل چمک کو اُس کے جلد کے رنگ سے مقابلہ میں دیکھ لیا۔ اُس کی بھاری آواز کا شکستہ لہجہ اُس جگہ صاف سنائی پڑ رہا تھا جہاں ماسٹر چھپا ہوا لیٹا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں کس کام کے لئے آیا ہوں۔ مجھے کسی کے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے" افسر نے چلاکر کہا اُس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر ادھر سپاہیوں میں کسی کی طرف دیکھا۔ "رہ تو سہی بتاؤں گا تجھے کہ باغی ہونے کا کیا مزہ ملتا ہے۔ سور کہیں کا!"

اینڈرسن کا دل اُچھلنے لگا۔ "اللہ توبہ!" اس نے خیال کیا۔ "کیا یہ ممکن ہے؟" وہ اپنے سر میں سردی محسوس کرنے لگا، گویا ٹھنڈک کی ایک لہر آکر ٹکرا گئی ہو۔

"افسر صاحب!" ایک خاموش، تھمی ہوئی مگر صاف آواز سپاہیوں کے حلقہ سے آئی "آپ کو کوئی حق نہیں ہے —— عدالت یہ فیصلہ کر سکتی ہے —— آپ جج نہیں ہیں —— یہ صاف قتل ہے۔ نہ کہ ——"

"چپ!" افسر گرج کر بولا۔ اُس کی آواز غصہ کے مارے بیٹھی جارہی تھی۔ "میں تمہارے لئے عدالت قایم کئے دیتا ہوں۔ —— آئو نو! آگے جاؤ"

اس نے اپنے گھوڑے کو مہمیز کیا اور آگے بڑھ گیا۔ اینڈرسن نے یہ بھی دیکھا کہ گھوڑا اپنے راستہ پر کیسی ہوشیاری سے چل رہا تھا اور اُس کے قدم ایسی نزاکت سے اُٹھ رہے تھے گویا ناچ کے لئے اٹھائے جاتے ہوں اور اُس کے کان ہر آواز سننے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ سپاہیوں میں اُس وقت تھوڑی دیر کے لئے ایک ہاہی پیدا ہوگئی اور پھر وہ مختلف سمتوں میں منتشر ہوئے۔ ان کے پیچھے تین آدمی کالے کپڑے پہنے رہ گئے جن میں دو لانبے تھے اور ایک بہت پستہ قد اور دبلا۔ اینڈرسن چھوٹے قد والے آدمی کے سر کے بال دیکھ سکتا تھا۔ یہ بہت ہلکے تھے۔ انڈرسن نے اُس کے کان بھی دیکھ لئے۔

اب وہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ کیا ہونے والا ہے۔ لیکن یہ بات اس قدر غیر معمولی اور خوفناک تھی کہ اُسے یہی خیال ہوا کہ وہ شاید خواب دیکھ رہا ہے۔

"کتنا صاف مطلع ہے! کتنا خوبصورت —— برف، کھیت، جنگل آسمان۔ ہر چیز پر بہار چھائی ہوئی ہے۔ مگر پھر بھی لوگ قتل ہونے والے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ناممکن!" اس کے خیالات پریشان ہوگئے اور وہ اپنے آپ کو ایسا محسوس کرنے لگا گویا یکایک اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔

یہ تینوں آدمی جنگلے کے پاس ایک، دوسرے سے ملے ہوئے کھڑے تھے، دو تو بالکل ہی قریب تھے اور ایک کچھ دور تھا۔

"افسر!" ان میں سے ایک شخص ناامیدی کے لہجہ میں بولا —— اینڈرسن یہ نہ دیکھ پایا کہ وہ کون تھا "خدا ہم سب کو دیکھ رہا ہے —— افسر!"

آٹھ سپاہی، اپنی تلواریں بجد طریقہ سے پکڑے، فوراً گھوڑوں سے اُترے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت جلدی میں ہیں اور چوری سے کوئی کام کر رہے ہیں۔

کئی سکنڈ خاموشی میں گزر گئے جس کے بعد سپاہی، ان سیاہ پوشوں سے چند فیٹ کے فاصلہ پر تلواریں باندھ کر کھڑے ہو گئے اور ان کی طرف نشانہ باندھا۔ مگر اسوقت ایک سپاہی کی ٹوپی سر سے گر پڑی۔ اُس نے اسے اُٹھا کر برف صاف کی اور پھر اُسے پہن لیا۔

افسر کا گھوڑا ابھی تک ایک جگہ ناچ رہا تھا۔ اُس کے کان اُسی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرے گھوڑے بھی جن کے تیز کان ہر آواز کو سُننے کے لئے اُٹھے ہوئے تھے، اپنی جگہ پر خاموش کھڑے انھیں سیاہ پوشوں کو دیکھ رہے تھے۔

" کم از کم بچے کو تو چھوڑ دو" ایک دوسری آواز یکایک فضا میں گونجی۔ "باجی۔ بچہ کو کیوں مار رہا ہے۔ اس نے کیا قصور کیا ہے؟"

" آ تو تو! جو کچھ میں نے تمھیں حکم دیا ہے وہ کرو" افسر نے اس طرح چلا کر کہا کہ دوسری آواز اسمیں گم ہو گئی، اس کا چہرہ سُرخ فلالین کی طرح لال بھبوکا ہو گیا۔

اس کے بعد ایک ایسا منظر دکھائی پڑا جو اپنی شقاوت میں انتہائی وحشیانہ اور نفرت انگیز تھا۔ پستہ قد سیاہ پوش نے بچوں کی طرح ایک چیخ نکالی اور ایک طرف گر پڑا۔ مگر فوراً ہی دو یا تین سپاہیوں نے اُسے پکڑ لیا۔ لڑکا ہاتھ پاؤں مارنے لگا اور دوسرے سپاہی دوڑ پڑے۔

" اُو۔ اُو۔ اُو۔ اُو" لڑکا چیخنے لگا۔ "مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو۔ او۔ او۔ او" اُس کی چیخ ہوا میں اس طرح گونجنے لگی جیسے کسی ذبیحہ کی چیخ جو پوری طور سے ہلاک نہ کیا گیا ہو۔ یکایک وہ خاموش ہو گیا۔ یقیناً کسی شخص نے اُس کا خاتمہ کر دیا ہو گا۔ ایک خلاف توقع اور ڈراؤنی خاموشی چھا گئی۔ لڑکا آگے کو ڈھکیلا جا رہا تھا۔ اس کے بعد ایک کان پھاڑ دینے والی آواز آئی۔ اینڈرسن کانپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اُس نے صاف طور سے۔ گو ایک خواب کی طرح — دونوں آدمیوں کو زرد چنگاریوں کی چمک، اور ایک صاف، چمکیلی فضا میں گرتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ سپاہی ان لاشوں کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو رہے ہیں۔ اُس نے ان کو کیچڑ سے بھری سڑک پر گھوڑے سرپٹ دوڑاتے دیکھا۔ ان کے ہتھیار بج رہے تھے اور ان کے گھوڑے کے سُم سے کٹا گٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔

اُس نے یہ سب بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ وہ یہ خود نہ سمجھ سکا کہ وہ گھاس کے گٹھے کے پیچھے سے کب اور کیوں کود کر باہر نکل آیا تھا۔ اُس کا چہرہ پسینہ سے تر تھا اور اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ ایک عجیب قسم

کی جسمانی تکلیف اُس کو ستا رہی تھی۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اُس کی یہ حالت کیوں ہے۔ اُس کی حالت ایک سخت بیمار کی طرح تھی بلکہ اُس سے بھی زیادہ تکلیف دہ

جب سپاہی جنگل میں غائب ہوگئے تو گولی چلنے کی جگہ پر لوگ جلدی جلدی پہونچنے لگے اگرچہ گولی چلنے تک ایک آدمی بھی نہیں دکھائی پڑا تھا۔

لاشیں، جنگلے کے دوسری طرف سڑک پر پڑی ہوئی تھیں۔ برف بھربھری تھی اور صاف فضا میں چمک رہی تھی۔ یہ لاشیں تین انسانوں کی تھیں۔ دو آدمیوں کی اور ایک بچہ کی۔ لڑکے کی لانبی نرم گردن برف پر پڑی ہوئی تھی۔ لڑکے کے قریب جو آدمی تھا اُس کا چہرہ چھپا ہوا تھا وہ اوندھے منھ خون کے ایک تالاب میں پڑا ہوا تھا۔ مقتول اچھے قد و قامت کا آدمی تھا اُس کی داڑھی سیاہ اور بازو مردانہ تھے وہ لمبا لمبا پڑا ہوا تھا اور اُس کے ہاتھ خون آلود برف پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس تپلی سڑک کے کنارہ جہاں آدمیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی ان کے اس طرح خاموش پڑے رہنے میں جو خوف معلوم ہوتا تھا اُس کو کوئی بیان نہیں کر سکتا!

اُس رات کو اینڈرسن نے اپنے اسکول کے کمرہ میں حسب معمول اشعار نہیں کہے۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑا کہر آلود نیلے آسمان پر اپنے سے دور چاند کے زرد ہالہ کی طرف دیکھتا اور سوچتا رہا۔ اس کے خیالات منتشر ڈراؤنے اور ایسے خوفناک ہوگئے تھے کہ اُس کا سر چکر کھا رہا تھا۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا گویا وہ اب بھی انھیں تینوں آدمیوں کو جن کو گولی ماردی گئی تھی۔ دیکھ رہا ہے۔ جو کھیت میں پڑے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے چاند کو اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

"کبھی وہ زمانہ آئے گا" اُس نے خیال کیا "جب دوسروں کے ہاتھوں سے لوگوں کا قتل بالکل ناممکن چیز ہو جائے گا۔ وقت آئیگا جب ان سپاہیوں اور افسروں کو جنھوں نے ان تینوں آدمیوں کو مارا ہے پتہ چل جائے گا کہ انھوں نے کیا کیا ہے اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ جس چیز کے لئے انھوں نے ان کو قتل کیا ہے وہ ان کے لئے بھی ایسی ہی ضروری، اہم اور عزیز ہے جتنی ان کے لئے جنھیں انھوں نے مار ڈالا ہے۔

"ہاں" اس نے زور سے اور سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ اس کی آنکھیں پر آب تھیں، "وہ وقت آئیگا" چاند کا زرد ہالہ اُس کی آنکھوں کی رطوبت کی وجہ سے داغدار معلوم ہونے لگا۔

ان تینوں مظلوموں کے لئے اُس کا دل رنج سے بھر آیا۔ اُس کے دل میں غصہ کی ایک لہر موجزن ہوگئی۔ مگر پھر اُس نے اپنے دل پر قابو حاصل کیا اور آہستہ سے کہا:۔

"وہ جو کچھ کر رہے ہیں جانتے ہیں" اس پرانے فقرہ نے اُسے اپنے غصہ پر قابو رکھنے کی قدرت دیدی۔

(۲)

مطلع اُسی طرح صاف اور خوشگوار تھا مگر بہار کے دن زیادہ گزر چکے تھے۔ بھیگی ہوئی زمین سے بہار کی خوشبو آرہی تھی۔ برف کے نیچے سے صاف اور ٹھنڈا پانی ہر جگہ بہتا تھا۔ درختوں کی شاخیں بہار کا نقشہ پیش کررہی تھیں اور لچکدار ہوگئی تھیں۔ میلوں تک زمین کے صاف اور نیلگوں قطعات پھیلتے چلے گئے تھے لیکن گاؤں میں بہار کی صفائی اور خوشی نہ تھی۔ یہ چیزیں گاؤں کے باہر جہاں کوئی بھی نہ رہتا تھا پائی جاتی تھیں۔ یعنی کھیتوں۔ جنگلوں اور کہساروں میں۔ گاؤں میں ہوا۔ دم بند، بھاری اور ڈراؤنی تھی جیسے کسی خواب میں ہو۔

اینڈرسن سڑک پر ایک پریشان دماغ لوگوں کے مجمع کے قریب کھڑا ہوا تھا اور سات کاشتکاروں کو کوڑے مارنے کیلئے جو انتظامات کئے جارہے تھے ان کو گردن آگے بڑھا بڑھا کر دیکھ رہا تھا۔

وہ برف میں کھڑے ہوئے تھے۔ اینڈرسن کو معلوم ہوگیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو وہ عرصہ سے جانتا اور سمجھتا ہے۔ اس خوفناک اور شرمناک چیز کی بدولت جو ان پر گزرنے والی تھی، وہ لوگ تمام دنیا سے جدا کردئے گئے تھے اور اسی لئے وہ اس چیز کا احساس نہیں کرسکتے تھے جس کا اینڈرسن کرتا تھا اور اسی طرح اینڈرسن وہ چیز نہیں سمجھ سکتا تھا جو ان کے دلوں میں تھی۔ ان کے چاروں طرف سپاہی بڑے بڑے گھوڑوں پر نہایت خوبصورتی سے کھڑے ہوئے تھے۔ یہ گھوڑے اپنے سر ہلا رہے تھے، اپنے چہرے ادھر اُدھر گھماتے تھے اور اینڈرسن کو نظر حقارت سے دیکھ رہے تھے کہ وہ عنقریب اس ظلم وستم کو دیکھیگا مگر کچھ نہ کرسکیگا اینڈرسن کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا اور اس کے آتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ گویا ندامت اور شرمساری نے برف کے دو ٹکڑوں میں اُسے دبوچ لیا ہے۔

سپاہیوں نے ایک کاشتکار کو پکڑا۔ اینڈرسن نے اس کی مترحم نظریں دیکھیں۔ اُس کے لب سے کوئی لفظ نہیں سنائی دیا اور اُس کی آنکھیں ادھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ ان میں اس قسم کی چمک پائی جاتی تھی، جیسی پاگل کی آنکھ میں ہوتی ہے اور یہ صاف ظاہر تھا کہ اُس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کے چہرہ سے فراست اور پاگل پن دونوں اس قدر عیاں تھے کہ جب سپاہیوں نے اُسے برف پر اُلٹا لٹا دیا اور بجائے ان آتشیں آنکھوں کے اُس نے اس کی ننگی پیٹھ چمکتی ہوئی دیکھی (جو ایک نہایت خوفناک اور شرمناک منظر تھا) تب جاکر کہیں اُسے اطمینان ہوا۔

ایک سپاہی جس کا چہرہ سرخ اور بڑا سا تھا اور جو ایک سرخ ٹوپی پہنے ہوئے تھا اُس کی طرف بڑھا اور اُس کے بدن کی طرف بہت خوش خوش دیکھنے کے بعد پکار کر صاف آواز میں کہا!

"اچھا۔ خدا کی مہربانی سے اُسے جانے دو۔"

انڈرسن کو ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ نہ سپاہی کو دیکھ رہا ہے، نہ گھوڑے کو اور نہ مجمع کو۔ اُسے نہ سردی معلوم ہو رہی تھی، نہ خوف اور نہ شرم، نہ وہ فضا میں کوڑے کی آواز سُن سکا اور نہ درد و رنج کی تکلیف دہ کراہ۔ اُس نے صرف ایک آدمی کی ننگی پیٹھ کو پھولتے اور اُس پر کوڑوں کے سفید اور زرد نشان دیکھے۔ رفتہ رفتہ اس ننگی پیٹھ کی صورت بدل گئی خون جسم سے اُچھل رہا تھا اور سفید برف کو رنگین بنا رہا تھا۔

انڈرسن کی روح خوف سے کانپنے لگی، اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جب اُس نے انھیں پھر کھولا تو دیکھا کہ چار اور سپاہی جو سرخ لباس میں ملبوس ہیں ایک دوسرے آدمی کو برف پر پٹک رہے ہیں اس کے بعد انھوں نے پھر اُسی بے شرمی، بدتمیزی اور بہیمیت سے اُس کی پیٹھ کو عریاں کیا۔۔۔ کس قدر پر درد نظارہ تھا!

اس کے بعد تیسرے کی باری آئی، پھر چوتھے کی اور یوں ہی ساتوں کی۔

اینڈرسن بھیگے ہوئے برف پر یوں ہی کانپتا، تھرتھراتا اور اپنی گردن بلند کرتا کھڑا رہا اور اس تمام اثنا میں ایک لفظ بھی نہ بولا۔ اُس کے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ نکل رہا تھا۔ وہ اسوقت شرم سے کٹا جا رہا تھا۔ اُسکے لئے یہ چیز نہایت شرمناک تھی کہ وہ اس ڈر سے سامنے نہیں آیا کہ کہیں وہ لوگ اُسے بھی نہ پکڑ لیں اور برف پر لٹا کر اُسے ننگا کر دیں۔

سپاہی بڑھتے گئے، گھوڑے اپنا سر ادھر اُدھر پھینکتے رہے، کوڑے کی آواز فضا میں اسی طرح گونجتی رہی اور عریاں انسانی گوشت ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا رہا، اُس کا خون بہایا اور اُس کا بدن سانپ کی طرح اینٹھایا جاتا رہا۔

اینڈرسن نے پھر پانچ آدمیوں کے چہرے ٹاؤن ہال کے زینوں پر دیکھے۔ یہ چہرے ان آدمیوں کے تھے جن کو اُس شرمناک حالت سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنی نظریں پھیر لیں، یہ دیکھنے کے بعد ایک آدمی کو مر جانا چاہئے، اُس نے خیال کیا۔

(۳)

وہ لوگ سترہ تھے۔ ۱۵ سپاہی، ایک نائب اور ایک بے ریش افسر۔ یہ افسر آگ کے سامنے لیٹا ہوا شعلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سپاہی ہتھیاروں کو ٹھیک کر رہے تھے۔

یہ لوگ سیاہ پھسلنے والی زمین پر خاموشی سے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے اور کبھی کبھی دہکتی ہوئی آگ میں سے جو لپٹے نکلے ہوئے تھے ان سے لڑ جاتے تھے۔

اینڈرسن اپنا اوورکوٹ پہنے اور اپنی چھڑی اپنی پشت پر لئے ان کے قریب آیا ماتحت "ایک موٹا تازہ مونچھوں دار آدمی" اٹھ بیٹھا اور آگ کی طرف سے اپنا منہ ہٹا کر اُس کی طرف دیکھنے لگا!

"تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟" اُس نے بڑی جلدی جلدی دریافت کیا۔ اُس کے لہجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس ضلع میں یہاں وہ ہلاکت، تباہی اور بربادی پھیلاتے جاتے ہیں، سپاہی ہر ایک سے خوف کھاتے ہیں۔

"افسر!" اُس نے کہا۔ "یہاں ایک آدمی ہے جسے میں نہیں جانتا"۔

افسر نے اینڈرسن کی طرف بغیر کچھ بات کئے دیکھا۔

"افسر صاحب!" ایک باریک آواز میں کہا "میرا نام نکلسن ہے۔ میں یہاں کا تاجر ہوں اور تجارت ہی کے سلسلہ میں جا رہا ہوں۔ مجھے یہ خوف تھا کہ شاید مجھے کوئی اور نہ سمجھ لیا جائے۔ سمجھے آپ!

"تو تم یہاں کیا بکواس لگائے ہوئے ہو؟" افسر نے غصہ ہو کر کہا اور منہ پھیر لیا۔

"ہوں۔ تاجر ہیں!" ایک سپاہی نے نہایت حقارت سے کہا۔ "اُس کی تلاشی لینا چاہئے، اس تاجر کی بات کہ وہ رات کو ادھر اُدھر نہ پھرتا رہے۔ اُسے شاید اس کی ضرورت ہے کہ اُس کے جبڑے پر ایک مُکا دیا جائے"۔

"یہ مشکوک آدمی ہے، افسر!" نائب نے کہا:۔ "آپ کی کیا رائے ہے، ہم اسے گرفتار کرلیں ہے جی؟"

"نہیں" افسر نے سستی سے جواب دیا۔ "میں ان لوگوں سے عاجز آگیا ہوں ـــ مار دو گولی"۔

اینڈرسن، بغیر کچھ اور کہے وہیں کھڑا رہا۔ اُس کی آنکھیں اندھیرے میں آگ کے پاس عجیب طرح سے چمک رہی تھیں۔ اور اس پستہ قد، صاف اور مضبوط جسم والے انسان کو رات کے وقت سپاہیوں میں اپنا اوورکوٹ اور بید لئے اور آگ کی روشنی میں اُس کی عینک کے شیشے چمکتے ہوئے دیکھنا عجیب منظر تھا۔

سپاہیوں نے اُسے یونہیں رہنے دیا اور آگے بڑھ گئے۔ اینڈرسن تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا اُسکے وہاں سے ہٹ آیا اور جلدی سے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

رات ختم ہو رہی تھی۔ ہوا سرد ہونے لگی تھی اور جھاڑیوں کی نوکیں زیادہ صاف دکھائی دے رہی تھیں اینڈرسن پھر فوجی چوکی گیا۔ لیکن اس مرتبہ وہ چھپ گیا اور جھاڑیوں میں ہوتے ہوئے جھکے جھکے آگے

جانے لگا۔ اس کے پیچھے آہستہ آہستہ اور خاموشی سے جھاڑیوں کو جھکاتے اور سایہ کی طرح خاموشی سے چلے آ رہے تھے۔ گبرائیل کے قریب اُسکی داہنے طرف ایک طویل آدمی اپنے ہاتھ میں ریوالور لئے ٹہل رہا تھا۔

پہاڑی پر سپاہی کی ایک شکل عجیب طرح سے کھڑی دکھائی پڑی اور بالکل غیر متوقع طور پر۔ وہ سپاہی اُس جگہ نہ تھا جہاں وہ اُسے دیکھ رہے تھے۔ بجھتی ہوئی آگ کی روشنی میں اس کی شکل دھندلی دھندلی دکھائی پڑتی تھی۔ اینڈرسن سپاہی کو پہچان گیا۔ یہ وہی تھا جس نے یہ تجویز کی تھی کہ اس کی جامہ تلاشی لی جائے اُسے دیکھ کر اینڈرسن کے دل میں کوئی تلاطم نہیں برپا ہوا۔ اس کا چہرہ ایک سوتے ہوئے آدمی کی طرح سرد اور بے حرکت تھا۔ آگ کے چاروں طرف بجز نائب کے جو اپنے گھٹنوں پر سر جھکائے بیٹھا تھا اور تمام سپاہی سو رہے تھے۔

اینڈرسن کے داہنے پر جو لانبا دبلا سا آدمی تھا اُس نے ریوالور اُٹھایا اور لبلبی دبا دی۔ ایک عارضی اندھا بنا دینے والا شعلہ۔۔ ایک زوردار کان کے پردہ پھاڑ دینے والی آواز!

اینڈرسن نے دیکھا کہ گارڈ نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور پھر زمین پر اپنا پیٹ پکڑ کے بیٹھ گیا۔ چاروں طرف سے چنگاریاں چمکیں اور ایک زبردست دھماکا پیدا ہوا نائب کھڑا ہو گیا اور آگ میں گر پڑا۔

بھورے سپاہی بھوت کی طرح ہر طرف دوڑنے لگے، اپنے ہاتھ پٹکنے لگے اور سیاہ زمین پر گر گر کر لوٹنے لگے۔ نوجوان افسر اینڈرسن کے پاس دوڑا۔ وہ اپنے ہاتھ ایک اجنبی اور خوفزدہ چڑیا کی طرح ہلا رہا تھا۔ اینڈرسن نے اپنا بید اُٹھایا اور اپنی پوری قوت سے اس نے افسر کے سر پر مارنا شروع کیا۔ ہر ضرب پر پھٹ، سے آواز ہوتی تھی۔ افسر دوسرے وار کے بعد چکر کھا کر گھوما اور جھاڑی سے ٹکرا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا جیسے بچے کرتے ہیں۔ کوئی اس طرف دوڑا اور گولی چلا دی جو ایسا معلوم ہوا گویا اینڈرسن کے ہاتھوں سے چلی ہے۔ افسر لڑکھڑایا اور زمین پر سر کے بل گر پڑا۔ اسکے پاؤں کچھ دیر تک جھٹکا کھاتے رہے اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔

گولیاں چلنی بند ہو گئیں۔ کالے آدمی جن کے چہرے سفید تھے سپاہیوں کی مردہ لاشوں کے درمیان چل رہے تھے اور کارتوس وغیرہ لے رہے تھے۔ اینڈرسن یہ سب ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا جب سب ختم ہو گیا تو وہ اوپر گیا، نائب کے پیر پکڑے اور کوشش کی کہ جسم کو آگ سے نکال لے مگر وہ اس کے لئے بہت بھاری تھا چنانچہ اسے اُس نے وہیں چھوڑ دیا۔

(۴)

اینڈرسن، ٹاؤن ہال کے زینہ پر خاموشی سے بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ اس نے

بہت بڑی بات کی، مگر پھر بھی اُس کے دل میں نہ رحم تھا، نہ شرم اور نہ افسوس۔ اگر اُسے آزاد کر دیا جائے تو وہ سمجھتا تھا کہ وہ پھر وہی کرے گا۔ اس نے کوشش کی کہ اپنا معائنہ کرے اور دیکھے کہ اُس کی روح کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ مگر اس کے خیالات بہت منتشر تھے۔ بعض وجوہ کی بنا پر اُس کے لئے ان تین آدمیوں کے متعلق سوچنا جو برف پر پڑے ہوئے اپنی مردہ اور بے نور آنکھوں سے دور دراز چاند کے زرد ہالہ کو دیکھ رہے تھے اُس مردہ افسر کے متعلق سوچنے سے زیادہ تکلیف دہ تھا جس کے سر پر اس نے دو بھدے وار کئے تھے۔ اپنی موت کا وہ خیال نہیں کر رہا تھا اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس نے ہر چیز کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اُسے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ کوئی شے مر گئی ہے، چلی گئی ہے اور اُسے خالی چھوڑ گئی ہے اور اسے اس کی نسبت خیال ہی نہ کرنا چاہئے۔

پھر جب وہ اُسے گھسیٹ کر لیجانے لگے تو وہ کھڑا ہو گیا لوگ جلدی سے اُسے باغ سے لیجانے لگے۔ جہاں کے لئے اپنے خشک سر اُٹھائے ہوئے تھے تو اس کے دل میں ایک خیال بھی نہ آیا۔

اُسے سڑک پر لیجایا گیا اور جنگلہ کے پاس ایک سلاخ سے پشت لگا کر کھڑا کر دیا گیا اُس نے اپنی عینک نکالی ہاتھ پیچھے کر لئے اور کھڑا ہو گیا۔ اُس کا سر تھوڑا سا ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ آخری لمحہ میں اس نے اپنے سامنے نظر کی اور دیکھا کہ رائفلوں کی نالیاں اس کے سر، سینہ اور پیٹ کی طرف ہیں، اس کے بعد اُس نے یہ بھی صاف صاف دیکھا کہ ایک رائفل جو اُس کی پیشانی کے مقابلہ میں تھی یکایک جھک گئی۔

اینڈرسن کے دماغ میں ایک پُر اسرار خیال جو دنیاوی نہ تھا یکایک آیا۔ اُس نے اپنے چھوٹے قد کو پوری طرح سے تان دیا اور فخر کے ساتھ اپنا سر سیدھا کر دیا۔ طاقت اور فخر کا ایک پر اسرار خیال اس کی روح میں موجزن ہو گیا اور اُس کے نزدیک ہر چیز — سورج، آسمان، زمین، انسان اور موت — معمولی دو راز کار اور بیکار نظر آنے لگی — گولیاں اُس کے سینہ، اُس کی بائیں آنکھ، اُس کے پیٹ اور صاف کوٹ پر پڑیں، اُس کی عینک ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اُس کے منہ سے ایک چیخ نکلی، اُس نے ایک مرتبہ چکر کھایا اور گر پڑا۔ اُس کی ایک آنکھ اب بھی بالکل کھلی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے زمین کو پکڑنے لگا جیسے وہ کسی چیز کا سہارا لے رہا ہو — افسر اُس کی طرف دوڑا اور اُس کی گردن پر ریوالور رکھ کر دو فائر اور کئے۔

اینڈرسن زمین پر لمبا لمبا لیٹ گیا۔

سپاہی اُسے چھوڑ کر جلدی سے چلے گئے مگر اینڈرسن زمین پر پڑا رہا۔ اُس کے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی دس سکنڈ تک تڑپتی رہی۔

(ماٹھکیل - پی - آرٹزبشو)

سوئٹزرلینڈ کا آئینِ وفاق

حکومتِ عوام از عوام

گزشتہ صحبت میں حکومت عوام کے پہلے جزو یعنی ریفرنیڈم (استصواب رائے عامہ) پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اب ہم دوسرے عنصر یعنی قانون سازیِ عوام کو لیتے ہیں۔

وفاقی حکومت میں عوام کے مطالبہ پر دستور اساسی میں تبدیلیاں ہوسکتی ہیں بشرطیکہ یہ مطالبہ پچاس ہزار شہریوں کی طرف سے ہو۔ مطالبہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ یا تو اسمبلی کے پاس کوئی ترمیم بھیجدی جاتی ہے جسے اسمبلی عوام میں نشر کردیتی ہے یا اسمبلی سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ ایک متعینہ اصول کو پیش نظر رکھ کر کوئی ترمیم کرے اس صورت میں اسمبلی عوام کے سامنے پہلے یہ سوال رکھتی ہے کہ آیا اسمبلی کو ترمیم تیار کرنی چاہئے یا نہیں؟ عوام کی منظوری حاصل ہوجانے پر ترمیم تیار کرکے رائے عامہ سے منظور کرالیتی ہے۔

جنیوا کے سوا باقی سب کینٹونوں میں شہریوں کی ایک مقررہ تعداد دستور اساسی پر نظر ثانی کا مطالبہ یا چند مخصوص ترمیمیں پیش کرسکتی ہے۔ لوزان، فری بورگ اور ویلائس ان تین کینٹونوں کو چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ کے باقی سب کینٹونوں میں شہریوں کی ایک معینہ تعداد یا تو بذاتِ خود کوئی نیا قانون تجویز کرسکتی ہے یا کینٹون کی کونسل کے پاس قانون کا بنیادی اصول ارسال کرکے قانون کی تشکیل کی درخواست کرسکتی ہے۔ الغرض کینٹوں کی کاؤنسل بھی عوام سے دریافت کرلینے کے بعد قانون بناتی ہے اور اُن کی منظوری اس پر حاصل کرلیتی ہے۔ اگر کاونسل سے بالا بالا کوئی مسودۂ قانون عوام تک پہونچا دیا جائے تو دستور کی رو سے کاونسل اُس کی مخالفت کی مجاز ہے اور وہ بھی اپنی طرف سے ایک متوازی مسودۂ قانون تیار کرکے عوام کے سامنے حصول رائے کی غرض سے رکھ سکتی ہے۔ بعض کینٹونوں میں کاؤنسل کبھی کبھی مطالبۂ قانون سازی کی مخالفت بھی کرتی ہے اور اُسکے کمزور پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی غرض سے اپنی رائے کی نشر و اشاعت کا بندوبست کرتی ہے۔

سیاسی پارٹیاں جس طرح سوئٹزرلینڈ کا آئین اپنی ترتیب اور شکل کے لحاظ سے عجیب و غریب ہے، اسی طرح سوئٹزرلینڈ کی سیاسی فضا بھی حیرت انگیز طور پر سکون پسند ہے۔ مذہب،

زبان اور نسل کے گوناگوں اختلافات کے باوجود بھی نظامِ حکومت کا سفینہ ملکی سیاسیات کے سمندر میں جماعت پرور مدوجزر کے بغیر چلا جاتا ہے۔ جہاں تک نسلی اور لسانی اختلافات کا تعلق ہے سوئٹزرلینڈ میں یورپ کے کسی زیادہ سے زیادہ منقسم ملک سے زیادہ جماعتی انتشار ہونا چاہیے تھا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں پارٹی بندی اور جماعتی کشمکش یک سرے سے بالکل مفقود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چار پانچ پارٹیاں ملکی سیاسیات کا جزو ہیں اول انتہا پسند پارٹی دوسری مرکزی پارٹی، تیسری کیتھولک پارٹی، چوتھی سوشلسٹ پارٹی اور پانچویں جمہوریت پسند پارٹی مگر یہ چیز اہلِ ہند کے لئے تعجب کا باعث ہوگی کہ ان میں سے کسی ایک پارٹی کی تشکیل بھی نسلی امتیاز یا فرق کے اصول پر نہیں ہوئی۔ انتہا پسندوں کی طاقت کا دار و مدار زیادہ تر جرمن زبان بولنے والے اور پروٹسٹنٹ کینٹونوں پر ہے مگر یہ فرانسیسی زبان بولنے والے کینٹونوں کی امداد سے بھی محروم نہیں ہوتے اسی طرح کیتھولک پارٹی کو جرمن زبان بولنے والے کینٹونوں سے بھی مدد حاصل ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ کے باشندے پارٹی سسٹم پر نظامِ حکومت چلانے کے قائل نہیں ہیں، وہ بہتر دماغ کے افراد پر بھروسہ کرتے ہیں اور انھیں کو ملک کی سیاسیات کی باگ سونپ دیتے ہیں، فرانس اور دولتِ برطانیہ میں اگر کوئی پارٹی لیڈر انتخابات میں ناکامیاب ہو جائے تو مخالف جماعت غلغلۂ مسرت سے آسمان سر پر اٹھا لیتی ہے مگر سوئٹزرلینڈ میں مخالفین عمداً ایسی نازک صورتِ حال کی پیش بندی کرتے ہیں اور مخالف پارٹی کے ناکامیاب لیڈر کو کسی عنوان بھی سیاسیات سے دستکش نہیں ہونے دیتے۔

یہ کہ سوئٹزرلینڈ کی سیاسی پارٹیوں کی تہ میں جماعتی امتیاز کارفرما نہیں ہے، یوں بھی ثابت ہوتا ہے کہ دیگر جمہوری ممالک میں خوشحال طبقوں کے افراد عموماً رجعت پسند یا لبرل پارٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مزدوروں اور متوسط طبقے کی ہمدردیاں عام طور پر انتہا پسندوں کو حاصل ہوتی ہیں مگر سوئٹزرلینڈ میں انتہا پسند پارٹی کے متعدد افراد ایسے بھی ہیں جو باعتبار حیثیت امیر طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مرکزی پارٹی میں انتہا پسند افراد کی کافی تعداد شامل ہے۔ سوشلسٹ پارٹی کو کسی حد تک جماعتی امتیاز کا حامل قرار دیا جاسکتا ہو مگر اس میں بھی بہت سے کم تنخواہوں کے سرکاری نوکر اور جمہوریت پسند شامل ہیں۔

سوئٹزرلینڈ کی سیاسیات میں پارٹیوں کو اتنی اہمیت کیوں حاصل نہیں؟ اس کا جواب کئی عناصر پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نصف صدی گذری کہ جمہوریت کا نظامِ حکومت پورے طور پر مستحکم ہو چکا ہے اور شہری حقوق کے اعتبار سے سوئٹزرلینڈ کے باشندوں کو مکمل جمہوریت حاصل ہے۔ چونکہ کسی بنیادی سیاسی تغیر کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، جماعتی کشمکش کی گنجائش ہی نہیں نو آبادیوں کے انتظام کے سوال کو بھی آئینِ حکومت میں کوئی دخل نہیں خارجی حکمتِ عملی دستوراً ہمیشہ سے

غیر جانبدارانہ رہی ہے، اس سلسلہ میں بھی کوئی نئی چیز دنما نہیں ہوتی دوسرے لفظوں میں سیاسی طور پر سوئٹزرلینڈ بالکل مطمئن ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اقتصادی اعتبار سے ملک میں کسی قسم کی بے چینی نہیں ہے، عام طور پر مزدور اور متوسط طبقے اپنی زندگی کی روش سے مطمئن ہیں اور نظام حکومت میں کوئی ترمیم ضروری نہیں سمجھتے۔

تیسرے مذہبی اختلافات گو بالکل مفقود نہیں مگر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وفاقی حکومت میں مذہبی مساوات کا دور دورہ ہے تاوقتیکہ وہ جائز حدود سے تجاوز نہ کریں، کیتھولک کینٹونوں کو اپنے قول و فعل میں مکمل آزادی حاصل ہے۔ جائز حدود سے یہ مطلب ہے کہ پروٹسٹنٹ کینٹونوں کے مذہبی احساسات کو ٹھیس نہ لگے۔

چوتھے تنفر انگیز جماعتی امتیاز کا نام و نشان نہیں۔ مالی اعتبار سے سب مساوی نہیں ہیں مگر اس طرح دولت کی نمائش نہیں کی جاتی کہ غریبوں کا جذبۂ حسد برانگیختہ ہو جائے۔

پانچویں اہل الرائے میں خود کوشی اور لیڈری کا جذبہ بہت کم ہے کیونکہ سوئٹزرلینڈ کے باشندے طبعاً شخصیت پرستی سے متنفر ہوتے ہیں وہ قابلیت کو سراہتے ہیں اور جن لوگوں کی ایمانداری اور اولوالعزمی کا یقین ہو جائے، ان کا احترام بھی کرتے ہیں۔ مگر بطل پرستی سے اُن کی فطرت بہت دور ہے۔

چھٹے سیاسیات کو وہ لوگ بازی طفلاں نہیں سمجھتے اُن کے نزدیک سیاسیات اتنی ہی اہم اور سنجیدہ چیز ہے جتنی تجارت جو اُن کی زندگی کی کفالت کرتی ہے۔

ساتویں کسی پارٹی کے رکن کو اُس پارٹی کے رکن ہونے کی حیثیت سے کبھی کوئی ذاتی فایدہ پہونچنے کا امکان نہیں ہوتا اور وہ کسی منصب یا اعزاز کا اس بنا پر مستحق نہیں سمجھا جاتا کہ وہ کسی خاص جماعت کا رکن ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں پارٹی سسٹم کمزور ہونے کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ اُن معاملات کا جو ملکی سیاسیات کے لئے مرگ و زیست کا حکم رکھتے ہیں رائے عامہ آزادانہ فیصلہ کرتی ہے اس لئے اسمبلی میں کسی پارٹی کا غلبہ ہو بھی جائے تو انجام کار اُس کے لئے سودمند ثابت نہیں ہو سکتا۔

آخری وجہ یہ ہے کہ حب وطن (وہ حب وطن جس کی رو سے قوم کے مجموعی مفاد کو اصولاً تمام اندرونی جھگڑوں پر فوقیت حاصل ہے) سوئٹزرلینڈ کے باشندوں کو متفق اور متحد رکھتا ہے۔

کانفڈریشن کی بہ نسبت کینٹونوں میں سیاسی زندگی زیادہ متحرک رہتی ہے۔ زرعی علاقوں میں لوگوں کی توجہ زیادہ تر مقامی معاملات پر مرکوز رہتی ہے۔ صنعتی کینٹونوں میں بھی سیاسی جماعتیں مختلف قسم کے سیاسی سوالات کے تصفیہ میں منہمک رہتی ہیں جیسی سیاسی پارٹیاں کانفڈریشن میں کام کرتی ہیں، ضروری نہیں کہ کینٹونوں میں بھی بعینہ ویسی ہی پارٹیاں ہوں۔ کیونکہ کینٹونوں میں انتخابات کا مقابلہ ملکی سے زیادہ مقامی مسایل

میں ہوتا ہے۔

جہاں تک کانفڈریشن کا سوال ہے اُس کی سیاسی فضا خارجی حکمت عملی کے سلسلہ میں تو یکساں رہتی ہے، کیونکہ خارجی پالیسی دستور اساسی کی رو سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر جانبدارانہ قرار دیجا چکی ہے۔ اندرونی معاملات میں عام طور پر ملکی مفاد اور کفایت زیر نظر رہتی ہے۔ معاشرتی اصلاح کے معاملوں میں پیش شدہ اسکیم کے حسن و قبح کو دیکھا جاتا ہے اور عام طور پر محتاط پالیسی اختیار کی جاتی ہے۔ مذہب، البتہ، تحریکِ جذبات کا باعث ہوتا ہے اور اُن کینٹونوں میں جہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ تعداد میں برابر برابر ہیں، اُن ابتدائی مدارس کے معاملہ میں جہاں ابتدائی مذہبی تعلیم کا سوال ہوتا ہے، پوری شدت سے دونوں فرقوں میں رسہ کشی ہوتی ہے تمام داخلی مسائل میں اقلیتوں کی نمایندگی کا مسئلہ ہی تنہا ایسا مسئلہ ہے جو خالص جماعتی زاویۂ نگاہ سے زیر بحث آتا ہے کیونکہ اس کے تصفیہ کا پارٹی کی قوت پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔

اب سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ انتہا پسند جن کو نظام حکومت میں غلبہ حاصل تھا یہ یقین رکھتے تھے کہ فرقہ وار نمایندگی اسمبلی اور اکزیکیٹو کے محکموں میں حکومت کے ہاتھ کمزور کردے گی کیونکہ اس طرح اسمبلی میں چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور ایسی اکثریتیں کم ہوجائیں گی جو نظام حکومت کو استحکام بخشتی ہیں۔ دوسری طرف سوشلسٹ اور کیتھولک اور لبرل پارٹیاں تھیں۔ نیشنل کاؤنسل میں انکی نمایندگی اُس تناسب سے کم تھی جو حلقہ ہائے نیابت کی رو سے انھیں پہونچتا تھا اس لئے یہ پارٹیاں تناسب کے لحاظ سے نمایندگی کی موید تھیں کیونکہ اس طرح انھیں اپنی قوت میں اضافہ ہوتا نظر آتا تھا چنانچہ ۱۹۱۸ء میں فرقہ وار نمایندگی قانوناً تسلیم کرلی گئی اور ۱۹۱۹ء کے انتخابات میں اس پر عمل درآمد ہوا۔

اس اعتبار سے کہ پارٹی سسٹم کمزور ہے اور اختلافی مسائل پر جماعتی ہیجان کا بہت کم اظہار ہوتا ہے، یہ بات کچھ زیادہ تعجب انگیز نہیں ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں نظام عمل کے اعتبار سے سیاسی جماعتیں اتنی پختہ اور منظم نہیں ہوتیں جتنی انگلینڈ، امریکہ اور آسٹریلیا میں۔ صرف سوشلسٹ ایک مقررہ پروگرام اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اپنے مقاصد کی تائید میں کافی پروپیگنڈا کرتے ہیں۔

جماعتی تنظیم کے لحاظ سے سوشلسٹوں کے بعد کیتھولک پارٹی ہے۔

سیاسی پارٹیوں کی اہمیت کی کمی اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ پارٹیوں کے پاس پارٹی فنڈ نہیں ہوتے، جب پارٹی کے سامنے تنظیم اور عمل کے سلسلہ میں کوئی باقاعدہ کام ہی نہو جس کے لئے رائے پیدا کرنے جلسہ منعقد کرنے، لٹریچر بانٹنے وغیرہ کے لئے روپئے کی ضرورت ہو، تو پارٹی فنڈ کی ضرورت ہی کیا۔ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ سیاسی زندگی میں افراد کا مطمح نظر ذاتی منفعت نہیں ہوتا۔ سوئٹزرلینڈ میں کسی سیاسی پارٹی کی

کامیابی سے اُس پارٹی کے لیڈر یا کسی رُکن کو کسی خاص فایدہ کی توقع نہیں ہو سکتی - ایک سیاسی پارٹی کے وجود سے کوئی شخص زیادہ سے زیادہ فایدہ یہ اُٹھا سکتا ہے کہ اپنے، اپنے رُفقا اور موئدین کے لئے حکومتی عہدے حاصل کرلے مگر سوئٹزرلینڈ میں سرکاری عہدوں کی تنخواہیں اسقدر کم ہیں کہ وہ باعث تحریص نہیں بن سکتے۔ فیڈریشن میں الکشن کے بعد عہدیداروں کی تبدیلی ضروری نہیں، کینٹونوں میں عہدے اتنی اہمیت نہیں رکھتے کہ اُنکے لئے جماعتی جنگ لڑی جائے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں ایک سیاسی پارٹی کا اثر اُن سیاسی اداروں پر کیسا پڑتا ہے جن کے ذریعہ عوام اپنی حکومت چلاتے ہیں۔ یہ ادارے مندرجۂ ذیل ہیں :- (۱) انتخابات - (۲) لیجس لیچروں میں پارٹیوں کا طرزِ عمل (۳) ریفرنڈم، اور قانونسازی عوام کے سلسلہ میں عوام کا طرزِ عمل (یعنی حق رائے دہی کا استعمال) (۴) اکزیکٹو کا طرزِ عمل جو کینٹونوں میں چھوٹی کاؤنسل اور وفاقی حکومت میں فیڈرل کاؤنسل ہے۔

(۱) انتخابات :- برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی سیاسی پارٹیاں مُلکی انتخابات ہی میں اپنا زور دکھاتی ہیں، سوئٹزرلینڈ میں ان ممالک کی بہ نسبت کہیں زیادہ انتخابات ہوتے ہیں بلکہ بعض ایسے سرکاری عہدوں کے سلسلہ میں بھی جو دوسرے ملکوں میں نامزدگی سے پُر کر لئے جاتے ہیں، سوئٹزرلینڈ میں افسران کا تقرر عام انتخاب کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ کانفڈریشن کے ممبران قومی کاؤنسل اور کینٹونوں کی بڑی کونسلوں کے ممبران بھی عام انتخاب سے تقرر پاتے ہیں، بہت سے کینٹونوں میں بھی چھوٹی کاؤنسل کے ممبر اور جج اور دیگر افسران کو رائے عامہ مختصر عرصہ کے لئے منتخب کرتی ہے۔

مگر انتخابات کی اسقدر زیادتی کے باوجود بھی باشندے اور پارٹیاں انتخابات میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لیتے بعض سیاسی پارٹیاں، تو انتخابات میں زیادہ آرا، حاصل کرنے کے لئے کوئی خاص کوشش بھی نہیں کرتیں وجہ یہ ہے کہ انتخابات میں رائے عامہ سے غلطی کرنے کے امکانات بہت ہی کم ہیں۔ غلط انتخاب کے وجوہ تین ہی ہوسکتے ہیں اول یہ کہ رائے دہندہ کو خوف دلاکر غلط نمایندہ کے حق میں اُس سے رائے حاصل کی جائے۔ دوسرے رشوت دیکر رائیں خرید لی جائیں، تیسرے دھوکہ بازی سے کام لیکر شمار آرا میں بد دیانتی کی جائے۔ سوئٹزرلینڈ میں اِن تینوں وجوہ کے وقوع کا کوئی امکان نہیں وہاں ساہوکار زمیندار طبقہ بالکل نہیں ہوتا جو اپنی رعیت پر ناجائز دباؤ ڈالے۔ باقی رہے کارخانوں کے مالک اور پادری لوگ، ان کا اثر مزدوروں اور عام مذہب پرستوں پر اتنا نہیں کہ یہ اُنھیں خوفزدہ کرکے کسی غلط نمایندہ کے حق میں اُن کی رائیں حاصل کرسکیں۔ رشوت ستانی اور رشوت دہی عنقا ہے کیونکہ اول تو نمایندے مالی حیثیت سے اس بار کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتے، دوسرے اگر وہ رشوت دینے کے قابل ہوں بھی تو اُنھیں اپنی سیاسی زندگی

میں اس کے بدل کی توقع ہی کیا ہو سکتی ہے۔

انتخابات کے اخراجات بھی بہت مختصر ہوتے ہیں، انگلینڈ، فرانس وغیرہ ممالک کے نمایندوں کی طرح سوئٹزرلینڈ کے نمایندے مالی اعتبار سے کسی طرح زیر بار نہیں ہوتے۔ انگلینڈ اور امریکہ میں نمایندے الکشن قریب آنے پر اپنے حلقہ کی ضرورتوں پر کافی روپیہ خرچ کرتے ہیں تاکہ رائے دہندگان اُن کی بنا وٹی فیاضانہ ہمدردی سے اثر قبول کریں، انگلینڈ میں گزشتہ تیس چالیس برس میں یہ دستور مسلمہ سیاسی روایات میں سے ہو گیا ہے مگر سوئٹزرلینڈ میں سیاسی زندگی میں داخل ہونا صرف اپنا قیمتی وقت ملکی معاملات میں صرف کرنے کے مرادف ہے کسی کی جیب سے کچھ خرچ نہیں ہوتا۔

الکشن میں پارٹی کا کام اس طرح شروع ہوتا ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنا نمایندہ پسند کرتی ہے، یہ عمل سوئٹزرلینڈ میں اتنا دشوار نہیں ہے جتنا انگلینڈ یا امریکہ میں ہے ویسے ہر شہری بلا کسی دعوت کے اپنے آپ کو نمایندگی کے لئے پیش کر سکتا ہے مگر عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ مقامی شاخ کی کمیٹی ایک مناسب آدمی چن لیتی ہے اور اُس کا نام ممبران کے ایک جلسہ میں پیش کر دیتی ہے، اس جلسہ میں اور نام بھی پیش ہو سکتے ہیں مگر عام طور پر کمیٹی کے نامزد افراد ہی نمایندے تسلیم کرلئے جاتے ہیں۔ دوبارہ الکشن چاہنے والے ممبران کی خواہش کو شاذ ہی رد کیا جاتا ہے بشرطیکہ اُن کی ذاتی کیریکٹر یا پارٹی سے اُن کی وفاداری مشتبہ نہو اور رائے دہندگان بھی ایسے شخص کو دوبارہ منتخب کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتے۔

نمایندگی کے معاملہ میں اُس شخص کو ترجیح دیجاتی ہے جو مقامی ہو یا کسی مقامی خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ ایک کینٹون کا شہری کسی ایسے حلقۂ نیابت کی طرف سے نیشنل کاؤنسل کا ممبر نہیں بنتا جو کسی دوسرے کینٹون میں واقع ہو مگر یہ "مقامیت" امریکہ کی بہ نسبت سوئٹزرلینڈ میں کم ہے، ہر پارٹی اپنی طرف سے اچھے نمایندے کھڑے کرنے کی کوشش کرتی ہے اگر ایک شخص کا اُس کے کیریکٹر اور قابلیتوں کی بنا پر احترام کیا جاتا ہو تو انتخاب میں وہ لوگ تک اُس کے حق میں رائے دیتے ہیں جو اُس کے سیاسی زاویۂ نظر سے متفق نہیں ہوتے، یہ کہ سوئٹزرلینڈ میں پارٹی اسپرٹ کتنی کم ہے اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حلقہ ہائے نیابت میں کافی تعداد ایسے حلقوں کی ہے جہاں سے نمایندہ متفقہ طور پر منتخب ہو کر آتا ہے اور بعض سال ایسے گزرے ہیں کہ نیشنل کونسل کی نصف سے زاید نشستیں ایسے نمایندوں سے پُر ہوئیں جو اپنے اپنے حلقہ ہائے نیابت سے بلامقابلہ منتخب ہو کر آئے تھے۔

(۲) لیجس لیچروں میں پارٹیوں کا طرزِ عمل :- پارٹی فیلنگ لیجس لیچروں میں بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ عموماً ایک ہی پارٹی کا بہت زیادہ مدت تک غلبہ رہتا ہے اور دوسری پارٹیوں کے افراد غالب پارٹی

کی آئینی فوقیت کو مسلم مان کر کام کرتے ہیں۔ ریفرنیڈم کے ذریعہ سے کسی بل کو نامنظور کرانے کے لئے بعض اوقات کئی پارٹیاں ملکر ایک ہوجاتی ہیں، یہ صورتِ حال مستقل نہیں کہی جاسکتی اس میں تبدیلی بھی ممکن ہے؛ جب کوئی ایسا سوال سامنے آتا ہے جس کے سلسلہ میں پارٹی کے متفقہ قدم اُٹھانے کی ضرورت ہو تو پارٹی کا (برائے نام) لیڈر، ممبران کے نام کوئی حکمنامہ جاری نہیں کرتا بلکہ یہ فیصلہ کرنے کے لئے میٹنگ طلب کرتا ہو کہ پارٹی کے ممبران کس طرح ووٹ دیں۔ اُن کے علاوہ جو دستورِ اساسی اور اُس کی تبدیلیوں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، باقی سب مسودۂ قوانین ملکی مفاد کی کسوٹی پر سختی کے ساتھ پرکھے جاتے ہیں اس بات کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا کہ ان کی منظوری یا نامنظوری کا پارٹی پر کیا اثر پڑے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں پارٹی کا مفاد کوئی اہمیت بھی نہیں رکھتا کیونکہ جہاں تک منظوری یا نامنظوری کا تعلق ہے آخری لفظ صرف عوام ہی کا فیصلہ ہے۔

(۳) عوام کا طرزِ عمل :۔۔۔ اس کا تذکرہ مفصل طور پر پہلے آچکا ہے۔ جہاں کہیں مناسب معلوم ہوتا ہے پارٹیاں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتی ہیں لیکن ایسے معاملوں میں کامیابی ہوجانا بھی کسی پارٹی کی پختگی پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ سوئٹزرلینڈ کا ووٹر ہر معاملہ پر خود غور کرنے کے بعد فیصلہ کرتا ہے۔

(۴) اگزیکٹو کا طرزِ عمل :۔ اگزیکٹو فیڈرل کاؤنسل، سول اور ملٹری تقرریوں میں کبھی کبھی پارٹی کے جذبہ کے ماتحت کام کرتی ہے مگر اُس کا روزانہ طرزِ عمل پارٹیوں سے بہت کم متاثر ہوتا ہے گو اس کے فرائض وہی ہیں جو فرانس یا برطانیہ کے کابینوں کے ہیں مگر اس میں اصابتِ رائے کی وہ پختگی نہیں ہے جو مندرجۂ بالا ممالک کے کابینوں کا خاص وصف ہے آپس کے اختلاف کے باوجود بھی اسکے ممبران سے ہم آہنگ ہوکر کام کرنے کی توقع کی جاتی ہے، اکثریت کی رائے کونسل کی رائے ہوتی ہے خواہ لیجس لیچر میں کاؤنسلر فرداً فرداً کچھ ہی کہیں۔

لیجس لیچر کے ممبران

سوئٹزرلینڈ میں لیجس لیچر کے ممبران کے لئے سیاست میں پڑنا کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے کیونکہ لیجس لیچر میں نشست حاصل کرنے سے کوئی ایسا فایدہ حاصل نہیں ہوتا جو معاش کی طرف سے بے نیاز کردے زیادہ سے زیادہ اسمبلی کا ممبر فیڈرل عہدے حاصل کرسکتا ہے مگر یہ عہدے اول تو بہت کم ہیں اور پھر پرانے عہدہ دار دوبارہ سہ بارہ منتخب ہوتے رہنے سے یہ عہدے خالی بھی کم ہی ہوتے ہیں۔

کینٹونوں میں بھی یہی کیفیت ہے گو بعض کینٹونوں میں اسمبلی کی نشست کو ذاتی ترقی کے لئے استعمال کرنے کے مواقع میسر آجاتے ہیں مگر اس کے باوجود بھی بحیثیت مجموعی یہی کہا جائے گا کہ سوئٹزرلینڈ میں سیاسیا

کوئی منفعت بخش مشغلہ نہیں ہے۔ ہر ممبر اسمبلی کے پاس اپنے گزارے کے لئے معقول نجی ذرائع ہوتے ہیں۔

ایک نمایندہ بعض اوقات دولت کے بل بوتے پر بھی منتخب ہو جاتا ہے مگر عام طور پر اُسکی مقامی حیثیت، چال چلن اور قابلیت ہی اُسے کامیاب بناتی ہے۔ ہر جماعت کے افراد اسمبلی میں آتے ہیں، امرا بیشتر اپنے کاروبار میں مصروف رہتے ہیں اور اس لئے بہت کم بطور امیدوار کھڑے ہوتے ہیں۔ بیشتر ممبران اسمبلی متوسط طبقوں کے افراد ہوتے ہیں۔ کانفڈریشن اور کینٹون دونوں جگہ ممبران پر اعتماد اور اُن کا احترام کیا جاتا ہے۔ اگر ایکبار ایک شخص غیر دیانتدار ثابت ہو تو اُس کی سیاسی زندگی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا

مجموعۂ استفسار و جواب ہر دو جلد

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی جلدیں ہیں جن کے ... اصفحات میں علم و ادب تاریخ و مذہب، نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے ان میں تقریباً .. ہم مسایل پر آپ کو وہ مواد ملے گا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو:۔

مسئلۂ جبر و اختیار خواب کی حقیقت معاد و خلود طبقۂ نسواں اور غزلگوئی برج بابل خاکسٹ جماعت سامری کون تھا باغ ارم کی حقیقت فلسفۂ محبت بھوت پریت اصحاب کہف سالوشن آرمی ہالہ کا سبب معجزہ و کرامات فرقۂ معتزلہ مذہب و عقل طوفان نوح یاجوج ماجوج۔ برہمو سماج طبقۂ نسواں اور تعلیم مریخ کی حقیقت منصور حلاج چند الفاظ کی تحقیق اصطلاحات تصوف کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ۔ قیمت ہر دو جلد معہ محصول خریداران نگار سے ۶ر - غیر خریداران سے ۹ر

منیجر نگار لکھنؤ

بنارس کی بیوہ

(فسانہ)

تجرد کی زندگی پُرامن ہو تو ہو، لیکن پُرکیف کبھی نہیں ہوتی۔ ابتدا میں بیوی بچوں کا جنجال بُرا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں یہی چیزیں سرمایۂ نشاط بن جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ازدواجی زندگی میں قدم رکھتے ہی انسان اپنے آپ کو ہر سمت سے گھرا ہوا پاتا ہے۔ اُس کی آزادیاں اُس سے چھین لیجاتی ہیں اُسکے مصارف بڑھ جاتے ہیں۔ اُس کی پریشانیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ تمام تکلیفیں اپنے اندر ایک خاص لذت بھی رکھتی ہیں اور سچ پوچھئے تو زندگی نام ہی "کشمکش حیات" کا ہے اگر یہ نہ ہو تو زندگی، زندگی نہیں، موت ہے۔ تجرد کی زندگی بسر کرنے والے دوسروں کی نظر میں خواہ کتنے ہی مسرور و شاداں نظر آتے ہوں لیکن خود انھیں سے پوچھئے کہ اُن کی زندگی کتنی بے کیف بسر ہوتی ہے۔ شروع میں تجرد کی زندگی گزارنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو کم، لیکن بعد میں اُنکی زندگی ایسی تلخ ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی کے نام ہی سے گھبرانے لگتے ہیں۔ جمود و تعطل کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ امن و سکون جس کے حصول کے لئے خدا معلوم کتنی روحیں بے چین و مضطرب ہیں کیا اُن کا کوئی مفہوم بھی ہے؟ آفتاب کا طلوع و غروب کتنا پُرکیف ہوتا ہے۔ شبِ ماہ کی خنک راتیں کس قدر نشاط انگیز ہوتی ہیں۔ چڑیوں کا ترنم کس طرح روح کی گہرائیوں کو متاثر کرتا ہے۔ دریا کی روانی کیسی حیات پرور ہوتی ہے۔ لیکن فطرت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ یہی چیزیں اگر دوامی شکل اختیار کر لیں اور ان میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہو، تو پھر ان میں کوئی کشش باقی نہ رہے۔ یہی حال انسانی زندگی کا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ آزاد رہے۔ اُسے امن و سکون کی دنیا میسر آئے۔ دنیاوی کلفتوں سے اُسے دوچار نہ ہونا پڑے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض افراد تجرد کی زندگی کو ازدواجی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن بہت جلد انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کا فیصلہ قوانین قدرت کے خلاف ہے۔ اور جس موہوم شئے کی اُنھیں تلاش و جستجو ہے، وہ چیز اُن سے بہت دور ہے۔

یہی چیز تھی جس نے بالآخر سرت چندر کو ازدواجی زندگی میں آنے کے لئے مجبور کیا۔ تعلیمی مشاغل کے

دوران ہی میں اُنھوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ تجرد کی زندگی گزاریں گے۔ اب اُنھیں ریلوے میں ملازمت بھی مل گئی تھی۔ تنخواہ معقول تھی۔ پورے اطمینان اور کافی لطف کے ساتھ زندگی بسر ہو رہی تھی۔ تنخواہ معقول تھی۔ پورے اطمینان اور کافی لطف کے ساتھ زندگی بسر ہو رہی تھی۔ ایسا شخص سوسائٹی میں بھی مقبول ہوتا ہے۔ دوستوں کی کمی نہ تھی۔ شام ہوئی۔ یہ دفتر سے لوٹے اور دوستوں کی آمد شروع ہوئی۔ دس، ساڑھے دس بجے تک ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر سب اپنے اپنے گھر واپس ہوئے کیسا اطمینان کتنی فارغ البالی اور کس قدر امن وسکون کی زندگی تھی۔ پورے دس سال اسی طرح گزر گئے لیکن اب سرت چندر کے لئے اس زندگی میں کوئی لطف نہ تھا۔ وہی صبح، وہی شام، وہی دفتر، وہی دوستوں کا جمگھٹا، وہی بے سر و پا باتیں، وہی بزم نشاط، وہی کیف و سرور۔ اُن کی زندگی تلخ تھی۔ دوستوں سے اُنھیں کلفت ہونے لگی۔ لوگ انھیں بد اخلاق کہنے لگے۔ لیکن سرت چندر کی زندگی اب انقلابی صورت اختیار کر رہی تھی۔ فطرت سے جنگ اب اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ اُن کا "آخری اور قطعی فیصلہ" اب متزلزل ہو چکا تھا۔ اُنھیں اب اسکا اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ زندگی اُسوقت تک زندگی نہیں ہے جب تک انسان ازدواجی زندگی میں قدم نہ رکھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملازمت میں آنے کے کامل دس سال کے بعد اُنھوں نے بنگال کے ایک غیر معروف گاؤں میں اپنی شادی کر لی۔

(۲)

مالتی شکل وصورت کے لحاظ سے کوئی خوبصورت لڑکی تو نہ تھی۔ لیکن اُسے بدصورت بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ اُس کی عمر اسوقت سولہ سال کی تھی۔ اُس کا رنگ سانولا نہیں بلکہ سیاہی مایل تھا۔ لیکن اُس کے چہرہ میں ایک کشش تھی، بلا کی کشش۔ وہ ایک پیکر معصوم تھی۔ دنیا کی آلودگیوں سے یکسر بے خبر، اُس کے ذہن میں گناہ و معصیت کا کوئی تخیل بھی نہ تھا۔ یہ اثر تھا دیہات کی سادہ معاشرت کا۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ اپنے شوہر کو خوش رکھے۔ اُس کی مرضی کو اپنی مرضی پر مقدم سمجھے۔ سرت چندر کو اب معلوم ہوا کہ مالتی کی ایک محبت بھری نظر اُس کی گزشتہ زندگی کی تمام مسرتوں سے کہیں زیادہ پرکیف ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ ایک تلخ حقیقت بھی تھی وہ یہ کہ کامل دس سال کی مجرد زندگی نے سرت چندر کو بعض ایسی باتوں کا بھی عادی بنا دیا تھا کہ جن کا ترک کرنا اب محال نظر آتا تھا۔ اور یہ اُن کی زندگی کا ایک بہت ہی پُردرد افسانہ تھا۔ مالتی بھی اسے دیکھتی لیکن وہ غریب اس معاملہ میں بالکل بے بس تھی۔ سرت چندر کی تنخواہ کا ایک تہائی حصہ تو ضرور ہر ماہ کلنر کمپنی کے نذر ہو جایا کرتا تھا۔ وہ خود بھی اپنی اس کمزوری کو محسوس کرتے تھے اُنھیں اس کا بھی پورا احساس تھا کہ مالتی اُن کی اِس روش کو پسند نہیں کرتی۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ

مالتی کو خوش رکھیں اور اُس کے جذبات کو پامال نہ ہونے دیں۔ لیکن شام کو جب تھکے ماندے وہ دفتر سے واپس ہوتے تو دن کا یہ تمام قول و قرار آیندہ کل کے لئے ملتوی ہو جاتا۔

(۳)

دانا پور اسٹیشن کے بالکل ہی قریب سرت چندر نے ایک کرایہ کا مکان لے لیا تھا۔ مکان چھوٹا تھا لیکن پختہ اور صاف۔ کل دو آدمی تھے۔ ایک سرت چندر دوسرے مالتی۔ یہ بڑی دقت تھی۔ سرت چندر باہر کے آدمی، تمام دن انہیں اپنے "مال گودام" سے کہاں فرصت تھی۔ مالتی کی تنہائی کا خیال رکھتے ہوئے انھوں نے ایک بوڑھی ملازمہ کی خدمت حاصل کر لی تھی جسے ایک روپیہ زاید وہ صرف اس بات کے لئے دیتے تھے کہ وہ تمام دن گھر میں موجود رہے۔ مالتی کے لئے سوائے "بھجوا کی مائی" کے (وہ اسی نام سے پکاری جاتی تھی) کوئی دوسرا رفیق نہ تھا۔ "بھجوا کی مائی" بنگلہ زبان سے قطعی ناواقف تھی اور مالتی کو ہندوستانی زبان میں گفتگو کرنے کی بہت ہی کم مہارت تھی۔ اس لئے مالتی کیلئے بھجوا کی مائی کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر تھا۔ مالتی کے لئے تمام دن کی تنہائی ناقابل برداشت تھی۔

(۴)

جاڑے کا دن اور سہ پہر کا وقت تھا۔ کوئی تین بجے ہوں گے۔ مالتی کمرہ میں بیٹھی بیٹھی اُکتا گئی تھی۔ وہ سائبان میں آئی، بھجوا کی مائی اپنی عادت کے بموجب کمبل میں لپٹی خراٹے لے رہی تھی۔ مالتی نے آپ ہی آپ کہا:-

"اس کے سونے کی بھی کوئی حد ہے، خدا معلوم اس کی نیند کو کیا ہو گیا ہے"۔

اتنے میں باہر سے کسی نے آواز دی— "بابو جی..... اے جی بابو جی"

مالتی لپک کر دروازہ کے قریب گئی۔ ایک نووارد عورت دروازہ پر کھڑی تھی جس کا سامان قلی لئے تھا اور قلی آواز دے رہا تھا۔

مالتی دوڑ کر سائبان میں آئی اور اُس نے بھجوا کی مائی کو زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ آخر کار وہ اُٹھی باہر گئی اور نووارد کو لئے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

نووارد ادھیڑ عمر کی ایک بنگالی عورت تھی۔ اور ملبوس سے یہ بات ظاہر تھی کہ وہ بیوہ ہے۔

اُس نے مالتی کو غور سے دیکھا۔ مالتی نے خیال کیا کہ شاید وہ اُسکے شوہر کی کوئی عزیزہ ہو۔ لیکن پھر کسی کے آنے کی پہلے سے کوئی اطلاع تو نہ تھی۔ مالتی سوچتی رہی اور اس بات کا بھی فیصلہ نہ کر سکی کہ وہ اُسے پرنام کرے یا نہ کرے۔

"یہ سرت بابو کا مکان ہے؟" نووارد نے دریافت کیا۔

"ہاں"

"تم اُن کی بیوی ہو؟"

مالتی نے اثبات میں گردن ہلائی اور اُس سے پوچھا۔ "آپ کہاں سے آرہی ہیں؟"

"میں بنارس سے آرہی ہوں" نووارد عورت نے کہا "میں اپنے وطن جارہی تھی۔ لیکن میرا ٹکٹ کہیں گم ہوگیا۔ اور ریلوے کے ملازموں نے مجھے یہیں اُتار دیا۔ اب مجھے یہاں سے دوسرا ٹکٹ خریدنا ہوگا۔ اُس گاڑی سے میں جا نہیں سکتی تھی اور دوسری گاڑی شب کو ساڑھے بارہ بجے جاتی ہے۔ اتنی دیر میں کیا کرتی۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں نزدیک ہی ایک بنگالی خاندان ہے اور میں وقت گزارنے کے لئے یہاں چلی آئی۔ میرا آنا تمہارے لئے کوئی تکلیف کا باعث تو نہیں ہے؟"

"بالکل نہیں" مالتی نے خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیا۔ "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ یہاں تشریف لائیں۔ بیٹھئے"

مالتی کے اشارہ پر بھجوا کی مائی نے زمین پر دری بچھا دی۔ مالتی نے بھجوا کی مائی کو فوراً ایک روپیہ دیا اور کہا کہ جلد بازار سے جاکر ناشتہ کی چیزیں لے آئے۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے" نووارد عورت نے کہا "میرے پاس ٹوکری میں پھل موجود ہیں لیکن اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو مجھے تھوڑا چاول کھلا دو۔ میں نے کل شام سے چاول نہیں کھایا ہے"

"ٹھیک ٹھیک۔ میں تو بالکل ہی بھول گئی" مالتی نے لجاجت کے ساتھ کہا۔ "دائی فوراً آگ جلاؤ جلدی کرو"

ملازمہ نے مالتی کو روپیہ واپس دیا اور باورچی خانہ میں جاکر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

نووارد اور مالتی دونوں دری پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔

"تمہارا نام کیا ہے بیٹی؟" نووارد نے پوچھا

"مالتی"

"تمہاری دادھیال کہاں ہے؟"

"اُتر پارا"

"تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟"

"میرے باپ تو میرے پیدا ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد انتقال کرگئے۔ اور ابھی میں بالکل کمسن ہی تھی کہ ماں بھی مرگئیں"

یہ کہتی ہوئی مالتی خود باورچی خانہ میں چلی گئی۔ بھجوا کی مائی آہستہ آہستہ چیزوں کو اِدھر سے اُدھر رکھ رہی

تھی - مالتی نے اُسے اس کی سستی پر ملامت کی اور خود ہی جلد جلد کاموں کو انجام دینے لگی۔

اس کے تھوڑی دیر بعد مالتی اپنے مہمان کے لئے کھانا پکا رہی تھی اور نو وارد اُس کے بغل میں بیٹھی اُس سے باتیں کر رہی تھی۔

"تمہاری شادی کب ہوئی" بنارس کی بیوہ نے دریافت کیا

"اسی بیساکھ کے مہینہ میں"

"صرف! تم یہاں کب سے ہو؟"

"تقریباً دو ماہ سے"

"تمہارے شوہر دفتر کب جاتے ہیں؟"

شوہر کا نام سن کر مالتی کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔

"نو بجے صبح کو" اُس نے شرم سے نظر کو نیچی کرتے ہوئے کہا

"اور وہ واپس کب آتے ہیں؟"

"چھ بجے اور کبھی سات بجے بھی"

(۵)

سرت چندر آج خلاف معمول دفتر سے کچھ سویرے لوٹے۔ مالتی نے مسکراتے ہوئے اُن کا خیر مقدم کیا "آج بہت سویرے آئے"

سرت چندر مسکرا دئے۔ بولے۔ "میں نے خیال کیا تم تنہا گھبراتی ہوگی اور اس لئے میں نے جلدی کی"

مالتی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ بولی "لیکن آج میں تنہا نہیں ہوں۔ سوچو کون آیا ہے؟"

سرت چندر نے تعجب سے پوچھا۔ "کون ہے"

"ایک بنارس کی بیوہ خاتون۔ بنارس سے وہ اپنے مکان جا رہی تھیں کہ راستہ میں اُن کا ٹکٹ کہیں گم ہو گیا اور ریلوے والوں نے انھیں یہیں اُتار دیا"

"بنارس سے آ رہی ہیں وہ؟ تنہا ہیں یا اُن کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟ اُن کی عمر کیا ہوگی"

"تنہا ہیں، اُن کی عمر ۴۰ - ۵۰ کے لگ بھگ ہوگی"۔

سرت چندر کو مالتی کے تخمینہ پر ہنسی آ گئی۔ "تمھیں چالیس پچاس میں اُس وقت تک فرق نہ معلوم ہوگا جب تک تم خود چالیس کی نہ ہو جاؤ" اُنھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ جس کی عمر سولہ سال کی ہے، اُس کے نزدیک چالیس اور پچاس میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن جس کی عمر چالیس سال کی ہے اگر اُسے پچاس سال کا کہا جائے تو یہ اُس کی کھلی ہوئی توہین ہے۔"

لیکن سرت چندر کی ہنسی دیرپا نہ تھی۔ انھوں نے تشویش کے ساتھ کہا۔

"اس جگہ تو بنگالی خاندان کئی ایک ہیں۔ وہ خاصکر یہیں کیوں تشریف لائیں"

"تمھیں کوئی عذر ہے؟" مالتی کا چہرہ افسردہ ہو گیا

"یقیناً۔ کیا وہ حسین بھی ہیں؟"

مالتی کو سرت چندر کا یہ سوال ناگوار گزرا۔ اُس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "تمھیں اس سے کیا مطلب؟"

"کیوں نہیں؟ مجھے بہت شبہ ہے۔ معلوم نہیں وہ کیسی عورت ہیں۔ بنارس سے آ رہی ہیں اور پھر بالکل تنہا۔"

مالتی اپنے شوہر کے مفہوم کو سمجھ گئی۔ بولی۔ "نہیں نہیں تمھارا خیال غلط ہے۔ وہ ایک شریف عورت ہیں۔"

"جیسے تم جانتی ہی ہو" سرت چندر نے طعن آمیز لہجہ میں کہا۔ "اور وہ جائیں گی کب؟"

"میں نے نہیں پوچھا۔"

"دوسری گاڑی رات کو ساڑھے بارہ بجے جاتی ہے"

"لیکن وہ رات کو اکیلی جائیں گی کیسے؟"

"تمھیں اس کی کیا فکر ہے؟ میں خود اسٹیشن پر جا کر انھیں سوار کرا دوں گا۔ جس قدر جلد وہ یہاں سے جائیں اُسی قدر بہتر ہے۔"

مالتی بیٹھ گئی۔ اُس کا چہرہ اُتر گیا۔ سرت چندر نے مالتی کی یہ کیفیت دیکھی تو پوچھا

"لیکن تم آخر ملول کیوں ہوئی جاتی ہو؟"

"بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی واپسی کی نسبت کچھ کہا نہیں۔ پھر میں کس طرح انھیں گھر سے نکالدوں"

سرت چندر بولے "تم اگر دقت محسوس کرتی ہو تو میں خود اس کا انتظام کر لوں گا۔ اُن کا یہاں زیادہ قیام مناسب نہیں ہے"

یہ کہکر سرت چندر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ شغل کا سامان موجود تھا۔ تھوڑی دیر میں سرت چندر بالکل دوسرے تھے۔ دن کی تمام کلفتیں دور ہو چکی تھیں۔ مالتی سے اب وہ انتہائی خوش طبعی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔

اِسی دوران میں بنارس کی خاتون باہر سے آئیں اور کمرہ کے دروازہ پر آکر کھڑی ہو گئیں۔ سرت چندر جلدی سے باہر آئے اور اُنھوں نے بہت ہی مودبانہ طریقہ سے خاتون کو "پرنام" کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت گوارا کی" بنارس کی بیوہ چپ رہیں سرت چندر پھر لجاجت کے ساتھ بولے "آپ کہاں رہتی ہیں ؟"

"آجکل میں بنارس میں رہتی ہوں"

"آپ کہاں جا رہی تھیں ؟"

"میں اپنے وطن واپس جا رہی تھی۔ لیکن راستہ میں میرا ٹکٹ کہیں کھو گیا"

"ہاں، ہاں" سرت چندر نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں نے سنا ہے۔ آپ بالکل اطمینان سے رہیں۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ جس گاڑی سے آپ آئی ہیں کل اُسی گاڑی سے آپ جائیں تو زیادہ بہتر ہے"

"تمہارا بہت شکریہ۔ لیکن ایک گاڑی رات کے ساڑھے بارہ بجے بھی تو روانہ ہوتی ہے"

"جاتی تو ہے۔ لیکن جانے کی آخر جلدی کیا ہے۔ سردی سخت ہے۔ آپ کو بہت تکلیف ہوگی۔ رات کی گاڑی سے جانا تو کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اور پھر میں آپ کو جانے کب دیتا ہوں" اور یہ کہکر انھوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

سرت چندر شال اوڑھ کر دوستوں سے ملنے چلے گئے۔ شب کو وہ واپس ہوئے تو رات کافی ہو چکی تھی نشہ میں مخمور تھے۔ مالتی نے پوچھا۔

"اتنی دیر کیوں ہوئی ؟" انھوں نے مالتی کے ایک چٹکی لی۔ بولے۔ "آج بہت ہی اچھی خبر ہے ؟"

"کیا ؟" مالتی نے جواب کا انتظار کرتے ہوئے کہا

"میرا تبادلہ تاری گھاٹ ہو گیا"

"اور تنخواہ میں بھی کچھ اضافہ ہوا ؟"

"ہاں"

مالتی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔

سرت چندر بولے۔ "تین چار دن میں ہم لوگوں کو وہاں چلا جانا ہوگا"

(۶)

صبح کو سرت چندر اُٹھے تو بنارس کی بیوہ موجود تھیں۔ اُنھوں نے مالتی کو کنارے لیجا کر پوچھا۔ "یہ رات کی گاڑی سے گئی نہیں ؟"

"عجیب آدمی ہو۔ وہ تو جانے کے لئے تیار ہی تھیں۔ تمہیں نے تو زبردستی اُنھیں روکا"

"ہاں ؟" سرت چندر نے آزردہ ہو کر کہا۔ "اچھا، میں دوپہر کے وقت خلاصی بھیج دوں گا تاکہ وہ

انھیں اسٹیشن پہونچادے۔ اور ہاں دیکھو۔ برتنوں سے ذرا ہشیار رہنا۔"
مالتی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے صرف اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے شوہر کو دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شوہر کے اس شبہ کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔

ناشتہ کے بعد مالتی اور بنارس کی بیوہ دھوپ میں دری بچھائے گفتگو میں منہمک تھیں۔ زمانہ کے بعد مالتی کو ایسی صحبت میسر آئی تھی۔ بھجوا کی مائی سے ہندوستانی میں گفتگو کرتے کرتے وہ عاجز ہو گئی تھی۔ دو بج چکے تھے، خلاصی کا انتظار تھا۔ بنارس کی بیوہ نے اپنی چیزوں کو یکجا کر لیا تھا اور جانے کے لئے تیار تھیں۔"

ڈھائی بج گئے۔ خلاصی نہ آیا۔ مالتی نے کہا "فرض کیجئے اگر آج آپ نہ جائیں اور دو ایک دن یہاں اور قیام کریں تو کوئی مضائقہ ہے؟ آپ کے آجانے سے میری طبیعت بہت بہل گئی ہے۔ تنہائی میرے لئے مصیبت ہے۔ میں آپ سے سچ کہتی ہوں بعض وقت میری طبیعت تو ایسی چاہتی ہے کہ زور زور سے رونے لگوں۔"

بنارس کی بیوہ نے کچھ تامل کے بعد کہا ــــ "مجھے تو کوئی عذر نہیں۔ لیکن تمہارے شوہر کو شاید میرا زیادہ قیام پسند نہ آئے۔"

"نہیں نہیں" مالتی نے جواب دیا، ہرچند اُسے اس کا پورا احساس تھا کہ اُن کا شبہ بالکل ہی ٹھیک ہے اُس نے سوچنا شروع کیا ــــ "وہ تو تمام دن دفتر میں رہتے ہیں۔ لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ شام کو دوست احباب کے ہاں بھی اُن کا جانا ضرور۔ اُن کی طبیعت تو ہر وقت بہلتی رہتی ہے۔ اُنھیں کیا معلوم کہ میں تمام دن کیسے کاٹتی ہوں۔ اب تو تنہائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ بھجوا کی مائی اکبخت تمام دن پڑی سوتی رہتی ہے۔ اُس کا رہنا نہ رہنا، دونوں میرے لئے مساوی ہے۔ اتفاق سے یہ آگئی ہیں۔ دو چار دن انھیں میں ضرور ٹھہراؤں گی۔ بگڑیں چاہے کچھ کریں۔ میں اُن سے صاف صاف کہدوں گی کہ تمھیں میری خوشی کا کچھ بھی خیال نہیں ......"

مالتی سوچتی رہی۔ اُسے سرت چندر سے بڑی محبت تھی۔ لیکن اسوقت وہ جذبات سے مغلوب ہو کر ایسا خیال کر رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مالتی کی جگہ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو وہ بھی اس تنہائی سے اکتا جاتی۔ ایک دو دن کی یہ مصیبت نہ تھی۔ صبح سے شام تک نہ کسی سے بات چیت، نہ ہنسنا نہ بولنا۔ شام کو سرت چندر آئے بھی تو ناشتہ پانی کرنے کے بعد ٹہلنے چلے گئے۔ اب مالتی دس گیارہ بجے رات تک شوہر کا انتظار کر رہی ہے۔ مالتی کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔

تین بج گئے غلام نہ آیا۔ گاڑی آئی اور چلی گئی۔ گاڑی کے جانے کی آواز دیر تک کانوں میں آتی رہی۔ مالتی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُسے اسوقت کتنا سکون تھا۔ مہمان سے اب وہ خوش خوش باتیں کر رہی تھی۔
شام کے وقت مالتی نے سرت چندر کے لئے بازار سے ناشتہ منگانا چاہا۔ بنارس کی بیوہ نے کہا:۔
"تم یہ تمام چیزیں بازار سے کیوں منگاتی ہو۔ خود ہی گھر پر کیوں نہیں بنا لیتیں"
مالتی نے کہا۔ "کون یہ جھگڑا کرے"
"جھگڑا کیا ہے؟" بیوہ عورت نے کہا "اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو یہ تمام چیزیں خود ہی پکا لیا کرتی"
مالتی خاموش رہی۔ عورت نے کہا۔ "آؤ آج ہم تم مل کر پکائیں۔ دیکھو گھر کی چیز کتنی اچھی اور پھر کس قدر کم دام میں تیار ہوتی ہے۔

(۷)

سرت چندر آج دفتر سے کچھ دیر میں واپس ہوئے۔ جب اُن کی نظر بنارس کی بیوہ پر پڑی تو وہ چلا اٹھے "مجھ سے کیا بھول ہوئی۔ بالکل ہی خیال نہ رہا کہ مجھے گاڑی کے وقت خلاصی پہنچنا ہے۔" مجھے آپ سے صد درجہ شرمندگی ہے" اُنھوں نے بنارس کی بیوہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "بہر حال چونکہ آپ نے دو دن یہاں تکلیف کی ہے ایک دن ہم لوگوں کے خیال سے اور سہی۔ مجھے کل کام پر جانا نہیں ہے۔ میں خود ہی کل آپ کو گاڑی میں سوار کرا دوں گا"
وہ کمرہ میں گئے۔ مالتی نے دیکھا کہ اُن کے منھ سے شراب کی بہت زیادہ بو آ رہی ہے۔ اس سے نہ رہا گیا، بولی۔ "تمہاری حالت دن بدن خراب ہوتی جاتی ہے۔ تاری گھاٹ میں جب تم زیادہ کماؤ گے تو اور اپنی حالت خراب کر لوگے۔
سرت چندر نے لاپرواہی کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔ "پاگل ہوئی ہو۔ وہاں کیا کوئی کلب کمپنی ہے۔ تاری گھاٹ، شہر سے باہر ایک چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ وہاں یہ چیزیں کہاں میسر۔ وہاں پہونچتے ہی میں اشنان کروں گا اور پھر "یکدم" چھوڑ دوں گا"
"یکدم" کے لفظ پر انھوں نے کافی زور دیا اور قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔
"کل دفتر جاؤ گے؟" مالتی نے پوچھا۔
"نہیں۔ آج میں نے تمام کام ختم کر دئے اور کام سمجھا بھی دیا۔ پرسوں میں نے اپنی ترقی کی خوشی میں اپنے دوستوں کو چار پر مدعو کیا ہے۔ اور کل مجھے اس کے متعلق تمام انتظامات کرنے ہیں"
اس کے بعد سرت چندر کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ آج، خلاف معمول، دسترخوان پر انواع واقسام

کی چیزیں موجود تھیں۔ انھوں نے مالتی سے پوچھا "آج یہ چیزیں کہاں سے آئی ہیں؟" مالتی نے بتایا سرت چندر بولے "میرے دماغ میں ایک بات آتی ہے۔ اگر یہ پرسوں تک یہاں ٹھہر جائیں تو ہم لوگوں کو دعوت کے انتظام میں بہت زیادہ سہولت ہو۔"

"لیکن تم خود اُن سے کہو تو بہتر ہے" مالتی نے مسرت کے ساتھ کہا۔

"لیکن اس حالت میں، میں اُن کے پاس جاؤں کیسے؟"

"بیوقوف!" مالتی نے کسی قدر ملامت آمیز لہجہ میں کہا "کیا تم نے دفتر سے آتے ہی اُن سے گفتگو نہیں کی ہے؟"

"ہاں؟" سرت چندر نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔ تھوڑی دیر بعد انھیں یاد آیا۔ بولے۔ "ہاں ہاں۔ ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے اُن سے باتیں کی تھیں"

مالتی نے شوہر کا پیام، بنارس کی بیوہ تک پہونچا دیا اور انھوں نے بخوشی اسے منظور بھی کر لیا۔

(۸)

اتوار کا دن تھا۔ سرت چندر آج ہی تاری گھاٹ روانہ ہونے والے تھے۔ بنارس کی بیوہ نے مالتی سے کہا "میں نے اپنی رائے بدل دی ہے۔ اب میرا خیال بنگال جانے کا نہیں ہے۔ میں بنارس ہی واپس جاؤں گی۔"

مالتی بولی۔ "تو پھر کیا اچھا ہوتا کہ آپ ہم لوگوں کے ساتھ ہی چلتیں اور دو ایک دن تاری گھاٹ میں بھی قیام کرتیں۔ تاری گھاٹ، بنارس سے تین چار اسٹیشن تو ہی ہے۔"

اسی دوران میں سرت چندر باہر سے آئے اور بازار کا حساب صاف کرنے کے لئے انھوں نے مالتی سے تیس روپئے طلب کئے۔

"تیس روپئے؟" مالتی نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن روپئے ہیں کہاں؟"

"کل ہی میں نے تمھیں اسّی روپئے لاکر دئے ہیں۔ کیا وہ سب خرچ ہو گئے؟"

"دیکھتی ہوں" مالتی بولی "لیکن دعوت ہی کے لئے تم نے گیشت مجھسے پچاس روپئے لئے تھے۔ اور پھر کل شام کو دوستوں کے لئے شراب منگانے کو تم نے کئی بار باہر سے روپئے منگائے۔" یہ کہتی ہوئی مالتی گئی اور اس نے اپنے بکس کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ کل دو روپئے چودہ آنے باقی ہیں۔

سرت چندر مضمحل ہو گئے۔ "اب میں کیا کروں؟" انھوں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تم خود ہی اس کے ذمہ دار ہو" مالتی نے قدرے سکوت کے بعد کہا "میں دیکھ رہی ہوں کہ تمھاری

یہ عادت تمھیں ایک دن تباہ و برباد کرکے چھوڑے گی۔ تمھیں کل کا خیال بالکل نہیں رہتا اور روپیہ کو اتنی بے پرواہی سے خرچ کرتے ہو۔"

سرت چندر نے مالتی کے وعظ و پند پر کوئی توجہ نہ کی اور یہ کہتے ہوئے باہر جانے لگے کہ میں کہیں سے انتظام کرتا ہوں۔

بنارس کی بیوہ یہ تمام باتیں باہر سے سن رہی تھیں۔ اُنھوں نے مالتی کو کنارے لیجا کر کہا "تمہارے شوہر کو مجھ سے روپیہ لینے میں کچھ تامل ہوگا، چونکہ اب میں مکان نہیں جارہی ہوں اس لئے اس وقت مجھے روپئے کی ضرورت بھی نہیں رہی ہے"

مالتی نے سرت چندر سے جاکر کہا۔ لیکن وہ بولے "نہیں ایسا کیونکر ممکن ہے اُن سے کس طرح قرض لے سکتے ہیں"

بنارس کی بیوہ خود ہی نزدیک آگئیں۔ بولیں "تمہیں مجھ سے قرض لینے میں کیا تامل ہے؟"

سرت چندر تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ پھر بولے۔ "آپ کی بہت مہربانی ہے۔ لیکن اگر آپ ہلوگوں کے ساتھ تاری گھاٹ چلیں تو میں پانچ چھ دن میں آپ کے روپئے ادا کردوں گا"

"کیوں؟ روپئے ادا کرنے کی اتنی جلدی کیا ہے۔ جب تمھارے پاس روپئے ہوں مجھے واپس دیدینا اس وقت تمھیں کتنے کی ضرورت ہے؟ صرف تیس کی؟ میرے پاس روپئے موجود ہیں۔ اگر زیادہ کی بھی ضرورت ہو تو مجھ سے لے سکتے ہو۔ آخر تم سوچتے کیا ہو؟ اس میں زحمت کیا ہے؟"

"جی ہاں تیس روپئے میں کام چل جائے گا۔ لیکن آپ کی بہت نوازش ہے"

بنارس کی بیوہ نے اپنا بکس کھول کر دس دس روپئے کے تین نوٹ سرت چندر کے حوالے کئے۔

اُسی دن رات کی گاڑی سے سرت چندر تاری گھاٹ کے لئے روانہ ہوگئے۔ بنارس کی بیوہ ساتھ تھیں۔ بھجوا کی مائی کو سرت چندر اپنے ساتھ لیجانا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے بہت اصرار کیا لیکن وہ کسی طرح تیار نہ ہوئی۔ تاہم اُس نے چلتے وقت کافی واویلا مچایا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کو اس جدائی کا بڑا قلق ہے کہ اس کا اثر کبھی زائل ہی نہیں ہوسکتا۔

مالتی چاہتی تھی کہ بنارس کی بیوہ کسی صورت سے تاری گھاٹ میں بھی دو چار دن قیام کرے۔ وہ اُن سے بہت زیادہ مانوس ہوگئی تھی۔ اُس نے گاڑی میں بھی اُن سے بہت اصرار کیا لیکن اُنھوں نے اپنی معذوری ظاہر کی۔ صبح کے وقت سرت چندر کو، دلدار نگر میں دوسری گاڑی بدلنی ہوتی تھی۔ وہاں اُنھوں نے بنارس کی بیوہ کو الوداع کہا۔

(۹)

صبح ہوتے ہی یہ لوگ تاری گھاٹ پہونچ گئے۔ یہاں ریلوے کا کوارٹر تھا۔ وہیں ان لوگوں نے قیام کیا۔ چیزوں کو قرینہ سے رکھنے کے بعد سرت چندر اپنے نئے رفیقوں سے ملنے باہر چلے گئے۔

مالتی نے غسل کرنے کے لئے ایک صندوق کھول کر اپنے لئے ایک ساری نکالنی چاہی۔ یہ وہ صندوق تھا جس میں وہ عموماً اپنے زیور کا چھوٹا بکس رکھا کرتی تھی۔ لیکن اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب اُسنے دیکھا کہ زیور کا بکس صندوق میں موجود نہیں ہے۔" اُسنے آپ ہی آپ کہا" یقیناً یہ کسی دوسرے صندوق میں ہوگا" اور یہ کہکر وہ ایک ایک صندوق کو کھول کھول کر دیکھنے لگی لیکن بکس کسی میں موجود نہ تھا۔

" نہیں نہیں یہ کہیں ضرور ہوگا" مالتی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور پھر اس نے ایک ایک صندوق کا جائزہ لیا۔ لیکن بکس کا کہیں پتہ نہ تھا"

بالآخر زمین پر وہ بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد سرت چندر واپس ہوئے تو انھوں نے مالتی کو اس حال میں دیکھکر پوچھا" کیا ہے؟"

مالتی نے ہچکی لے لے کر تمام واقعات سرت چندر سے دہرائے۔ سرت چندر کا رنگ زرد پڑ گیا۔ انتہائی غم و افسوس کے ساتھ وہ ایک کرسی پر گر پڑے اور پوچھا۔

"تم نے تمام سامان دیکھ لیا ہے؟"

"ہاں"

"سب سے اخیر مرتبہ تم نے بکس کو کب دیکھا تھا؟"

"مجھے یاد ہے، میں نے کل داناپور میں اسے بڑے صندوق میں رکھا تھا"

"تمھیں یاد ہے، تم نے کوئی چیز نکالنے کے لئے صندوق کو گاڑی میں کھولا بھی تھا؟"

"ہاں - ایک مرتبہ۔ مجھے بہت سردی معلوم ہو رہی تھی تو شال نکالنے کے لئے میں نے ایکبار کھولا تھا"

"ہوسکتا ہے کہ تم نے بکس کو باہر نکالا ہو اور پھر رکھنا بھول گئی ہو"

"نہیں" مالتی نے تیقن کے ساتھ کہا۔" شال تو اوپر ہی تھی۔ میں دوسری چیزوں کو کیوں الٹ پلٹ کرتی"۔

"اس کے بعد تم نے کنجی کہاں رکھی؟"

"کنجی کو میں نے اپنے کمر بند میں باندھ لیا تھا"

"اور پھر تم اس کے بعد سوگئیں"

"ہاں" مالتی نے اپنے شوہر کے چہرہ پر خاموش نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔
"میں سمجھ گیا" سرت چندر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے۔ "یہ اُسی اجنبی عورت کا کام ہے"
مالتی نے اس کی تردید نہ کی۔ خاموش رہی۔ سرت چندر پھر بولے۔ "جب تم سوگئی ہوگی تو اُس نے آہستہ سے کنجی تمھارے کمر بند سے کھول لی ہوگی۔ تم نام جانتی ہو؟"
"نہیں۔ میں اُن سے اُن کا نام کیونکر پوچھتی۔ وہ تو مجھ سے عمر میں بہت کافی بڑی تھیں"
"وہ، بنارس میں رہتی کہاں ہیں؟"
"کسی مٹھ میں"
"کسی مٹھ میں؟ وہاں تو سیکڑوں مٹھ ہیں"۔
اب سرت چندر برہم ہو چلے تھے۔ بولے "میں نے تمھیں پہلے ہی متنبہ کیا تھا کہ ایسے لوگوں پر اعتماد ویقین نہ کرنا چاہیئے۔ یہ بنارس کی عصمت فروش عورتیں، ایک مستقل عذاب کی صورت اختیار کیے ہوئے ہیں" سرت چندر کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ بولے "اُس نے اپنے تیس روپیے سے اچھا سودا کیا"
"لیکن مجھے یقین نہیں آتا ہے کہ انھوں نے ایسا کیا ہوگا۔ ممکن ہے میں نے خود ہی داناپور میں اسے چھوڑ دیا ہو" مالتی نے قدرے یقین کے لہجہ میں کہا۔
لیکن سرت چندر نے اس پر کوئی توجہ نہ کی۔ "تمھیں دُنیا کا بہت کم تجربہ ہے۔ تم کیا جانو کہ دنیا میں کیا ہوتا ہے" یہ کہتے ہوئے سرت چندر پولس کو اطلاع دینے کیلئے باہر چلے گئے۔

(۱۰)

پندرہ دن گزر گئے۔ زیوروں کا غم دن بدن کم ہوتا گیا۔ اب پھر سرت چندر اور مالتی خوشی کی گھڑیاں گزار رہے تھے۔ سرت چندر کا موجودہ کام کافی نفع بخش تھا۔ اس نے ان لوگوں کے غم کو غلط کر دیا تھا۔
خبر پاتے ہی دلدار نگر کے جمعدار اُسی دن تارگھاٹ پہونچ گئے تھے۔ اُنھوں نے سرت چندر کا بیان قلمبند کر لیا تھا اور زیوروں کی ایک مکمل فہرست بھی مانگ لی تھی۔ لیکن اب تک پولس کی طرف سے کوئی خبر نہ آئی تھی۔
ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ سرت چندر دفتر گئے ہوئے تھے۔ مالتی دن کا کھانا کھا رہی تھی کہ دلدار نگر سے گاڑی آئی۔ مالتی کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی گاڑی پلیٹ فارم پر آتی تو وہ دوڑ کر کھڑکی میں چلی جاتی اور اسٹیشن کی چہل پہل کو غور سے دیکھا کرتی۔ گاڑی کے آنے پر پلیٹ فارم پر کیسی زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ مالتی کو یہ منظر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بچوں کی طرح اسے غور سے دیکھتی اور بہت لطف حاصل کرتی۔

اس وقت بھی وہ کھانا چھوڑ کر دریچہ کی طرف دوڑ گئی۔ بالکل غیر متوقع منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ بنارس کی بیوہ گاڑی سے اُتر کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئیں۔ قلی اُن کا سامان اُتارنے لگا۔ مالتی نے دیکھا کہ انھوں نے قلی سے کچھ دریافت کیا اور قلی نے اُس کے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

مالتی کا دل دھڑکنے لگا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود چند لمحوں میں چوری کے الزام میں ماخوذ ہونے والی ہے۔ وہ دوڑ کر واپس ہوئی۔ بچے ہوئے کھانے کو اُس نے جلدی جلدی علٰحدہ رکھا اور اپنے آپ کو سنبھالنے لگی۔ اُس کی حالت غیر ہوئی جاتی تھی۔ خیالات کا ایک سیلاب تھا جو اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ "خدا کرے انھیں اسکی واقفیت نہ ہوئی ہو کہ میرے شوہر نے اُن پر چوری کا شبہ کیا ہے" کتنے معصوم جذبات کے ساتھ وہ خدا سے دُعائیں کر رہی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مالتی اب تک بنارس کی بیوہ کو اس معاملہ میں قطعی بے گناہ سمجھتی تھی۔ اور اب تو اُسے یقین کامل ہو گیا کہ یہ اُنکا کام نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اُنھیں آنے کی یہاں دوبارہ جرأت کیسے ہوتی۔

چند لمحوں کے بعد بنارس کی بیوہ مالتی کے سامنے تھیں۔ مالتی نے اُنھیں "پرنام" کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ تشریف لائیں" بیوہ نے مالتی کے سر پر محبت کا ہاتھ دھرا اور آہستہ آہستہ دعائیں دیں۔ مالتی نے چاہا کہ کھانے کا انتظام کرے۔ لیکن بیوہ نے روکا اور کہا "تمھیں اس کی زحمت نہ کرو۔ آج ایکادسی ہے اور میں برت سے ہوں۔ دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ مالتی نے دیکھا کہ اُس کے مہمان کا چہرہ بالکل اُترا ہوا ہے۔ شگفتگی نام کو بھی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دماغ پر کوئی بوجھل چیز رکھی ہے اور وہ حد درجہ ملول اور افسردہ ہے۔ مالتی نے کہا۔ "کیوں، آج آپ کچھ ملول نظر آتی ہیں"۔

"تمھیں تو اس کی وجہ جاننی چاہئے" بیوہ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیسے؟" مالتی کی زبان سے نکلا اور وہ جواب کا لرزتے ہوئے انتظار کرنے لگی۔

"تمھیں شبہ ہے کہ میں نے تمھارے زیور چرائے۔ تم نے پولیس کو میرے پیچھے دوڑایا اور پھر تم مجھسے دریافت کرتی ہو کہ میں کیوں ملول نظر آتی ہوں"۔

مالتی کی زبان تھوڑی دیر کے لئے گنگ ہو گئی۔ انتہائی شرم و ندامت کے لہجہ میں وہ صرف اتنا کہہ سکی کہ "آپ کو یقین ہے کہ میں نے ایک لمحہ کے لئے بھی ایسا شبہ اپنے دل میں پیدا کیا ہوگا؟"

"لیکن تمھارے شوہر نے تو ایسا کیا" بنارس کی بیوہ نے ذرا تلخ لہجہ میں جواب دیا۔

مالتی معذرت کے ساتھ پھر بولی۔ اُنھیں یقین نہ تھا کہ پولیس آپ کو تلاش کر سکے گی۔ آج ہی صبح کو وہ مجھسے کہہ رہے تھے کہ بنارس میں بے شمار مٹھ ہیں اور یہ قطعی ناممکن ہے کہ کسی گمنام ہستی کو اُن تمام

مٹھوں میں سے تلاش کیا جا سکے"۔

"لیکن پولیس نے بہرحال مجھے تلاش کر ہی لیا اور انھوں نے مجھ اسقدر پریشانیوں میں مبتلا کیا کہ بالآخر مجھے دو سو روپیے دیکر اُن سے اپنی جان چھڑانی پڑی۔ یہ تم لوگوں سے دوستی کا انجام ہے۔ مجھے سخت افسوس ہے"

تھوڑی دیر تک کامل خاموشی رہی۔ پھر بنارس کی عورت نے کہا "تمھارے شوہر واپس کب ہوتے ہیں؟"

"رات سے گئے"

آسمان پر ابر آنا شروع ہوئے۔ آفتاب بادلوں میں چھپ گیا۔ بنارس کی بیوہ نے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بارش کے آثار معلوم ہوتے ہیں"

"کیوں؟" مالتی نے پوچھا

"مجھے آج ہی جانا ہے"

"آج ہی!" مالتی نے طفلانہ سادگی سے پوچھا۔ "کیوں؟ جلدی کیا ہے؟"

"بیوہ کے ہونٹوں پر ایک ہلکا تبسم آیا اور انھوں نے کہا۔ "بیوقوف لڑکی۔ تیرے شوہر مجھے ڈاکو تصور کرتے ہیں اور تو چاہتی ہے کہ تیرے ہاں اور ٹھہروں۔ نہیں مجھے آج ہی ڈھائی بجے کی گاڑی سے جانا ہے۔ میرے مٹھ کی بہت سی عورتیں جاترا کے لئے جارہی ہیں اور مجھے بھی اُن لوگوں کے ساتھ جانا ہے"۔

"آپ وہاں کیا زیادہ دنوں تک رہیں گی؟" مالتی نے پوچھا

"کیوں پوچھتی ہو؟" بیوہ نے آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے ہوئے کہا۔ "کیا تم خیال کرتی ہو کہ پھر ہم تم مل سکیں گے؟"

بیوہ کا دل بھر آرہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں غم و الم کا ایک دریا لہریں مار رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد عورت نے کہا "میری بچی کیا تو مجھے خوش کرنا چاہتی ہے؟"

"ہاں" مالتی نے سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

"میرے پاس یہاں کچھ زیور ہیں۔ کیا تم اُنھیں میری خواہش سے پہن سکتی ہو" اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنے ایک صندوق کو کھولکر ایک اعلیٰ درجہ کا بکس نکالا۔ بکس بہت خوشنما تھا۔ اُنھوں نے بکس کا ایک بٹن دبایا جس سے اُس کا ڈھکنا خود بخود کھل گیا۔ سونے کے زیور ہیرے، یاقوت اور دوسرے قیمتی پتھروں سے مزین۔ مالتی کی آنکھیں خیرہ ہوکر رہ گئیں۔

عورت نے محبت آمیز لہجہ میں کہا "یہ چیزیں میں اپنی طرف سے تمھیں دیتی ہوں" تھوڑی دیر کیلئے مالتی ششدر اور مبہوت ہوکر رہ گئی۔ پھر اُس نے کہا۔ آپ مجھے معاف فرمائیں میں اِن چیزوں کو نہیں

...ول کر سکتی۔"

"کیوں نہیں،" عورت نے شکایت کے لہجہ میں پوچھا

"کیوں؟ میں یہ تمام چیزیں آپ سے کیوں لوں۔ یہ تو بہت ہی قیمتی ہیں۔"

"لیکن میں تو اپنی خوشی سے یہ چیزیں تمھیں دے رہی ہوں۔"

"ہو۔ لیکن مجھے کیا حق حاصل ہے کہ میں انھیں لوں۔ نہیں، میں نہیں لوں گی۔"

آسمان بہت زیادہ ابر آلود ہو گیا تھا۔ طوفان کے بھی علامات نظر آرہے تھے۔ دن کی روشنی تقریبًا مفقود ہو چکی تھی۔

عورت نے دھیمی آواز میں لیکن ایک ایک لفظ پر زور دیکر کہا۔ "فرض کرو کہ تمھیں اسکا حق حاصل ہے"

"مجھے اس کا حق حاصل ہے؟ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" مالتی نے حیرت واستعجاب کے لہجہ میں پوچھا"

بیوہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بولیں "ہاں میں تم سے کہوں گی۔ اور اسی لئے آج میں تمہارے پاس ...ائی بھی ہوں۔"

مالتی کا دل کسی غیر متوقع خطرہ سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے عورت کی طرف مضطربانہ نگاہ ڈالی۔

"کیا واقعی تمھاری ماں مر چکی ہے؟" عورت نے پوچھا۔

"لوگ تو ایسا ہی کہتے ہیں؟" مالتی نے انتہائی سراسیمگی کے عالم میں جواب دیا۔

"تو پھر تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں ہی تمھاری بدقسمت ماں ہوں۔" لیکن اتنا کہکر وہ ضبط نہ کر سکی۔ اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

مالتی کی حالت اسوقت ایسی تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ بالکل غیر شعوری طور پر وہ اپنی ماں سے علحدہ ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے دماغ میں یک بیک ایک واقعہ کی یاد تازہ ہوئی جو آج سے چند ماہ پہلے پیش آیا تھا۔ داناپور آنے سے پہلے وہ اپنی دادھیال میں تھی۔ ایک دن شب کے وقت وہ سو رہی تھی۔ اور بغل ہی میں اُس کی چچی اور ایک ضعیفہ جس کا نام مکشودھا تھا اور جسے مالتی "دادی دادی" کہکر پکارتی تھی سوتی تھیں۔ شب کے وقت مکشودھا، اس کی چچی سے کوئی راز دارانہ گفتگو کر رہی تھی۔ لیکن مالتی کی نیند ٹوٹ چکی تھی اور مکشودھا کو اس کی خبر نہ تھی کہ مالتی جاگ رہی ہے۔ مکشودھا ابھی ایک طویل تیرتھ سے واپس آئی تھی۔ مالتی نے جو کچھ سُنا اُس سے ایک ایسے راز کا انکشاف ہوا کہ مالتی کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ اُسے بالکل پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اُس کی ماں جسے آج تک وہ مردہ سمجھ رہی تھی دراصل مری نہیں ہے اور مکشودھا سے اتفاقیہ طور پر اُس کی ماں سے ایک تیرتھ میں ملاقات ہو گئی تھی۔ سب سے عظیم صدمہ

جو مالتی کو ہوا وہ یہ جان کر ہوا کہ جس ہستی کی مقدس یاد وہ اپنے دل میں آج تک تازہ رکھتی آ رہی تھی وہ دنیا کی نظروں میں ایک "بدچلن عورت" ہے۔ مالتی کو جیسی روحانی تکلیف اُس رات کو ہوئی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ "اور یہ عورت جو اُس کے سامنے کھڑی ہے وہ اُس کی وہی ماں ہے!"

اُس کی ماں اب تک زار و قطار رو رہی تھی۔ آنسوؤں کی ایک بارش تھی جو کسی طرح نہ رکتی تھی۔ اُنھوں نے اپنی طبیعت کو روکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میرے داماد کو بھی اس کی خبر ہے؟"

"نہیں۔ اُنھیں نہیں معلوم"

"تمھیں اس واقعہ کی اطلاع کب ہوئی"

"شادی کے بعد"

"مکشودھا چچی سے سُنا ہوگا؟"

"ہاں"

"مجھے بھی اُنھیں سے معلوم ہوا کہ تمھاری شادی اب ہو چکی ہے۔ اور تمھارے شوہر داناپور میں مال بابو ہیں۔ اُنھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ تم آسوں کے مہینہ داناپور جاؤ گی"

مالتی نے اپنی ساری کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "تو یہ محض اتفاقیہ طور پر آپ داناپور نہیں آئی تھیں۔ لیکن آپ آئیں کیوں؟" مالتی کے لہجہ میں اب ذرا سختی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ کبھی وہ ایسے مجرم کے ساتھ ہمدردی نہیں کر سکتی۔

غریب ماں پر پھر رقت طاری ہوئی اور اُس نے اُسی عالم میں رُک رُک کر کہا۔ "کیا کوئی اپنی اولاد کو بھی بھول سکتا ہے" لیکن اتنا کہتے کہتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔

اب مالتی کو بھی رونا آ رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں اب تک یہ بات نہ آئی تھی کہ ایک نووارد عورت سے وہ کیونکر پہلی ہی ملاقات میں اس درجہ مانوس ہو گئی تھی۔ لیکن اب اُسے معلوم ہوا کہ یہ محض خون کی کشش تھی، کوئی اور بات نہ تھی۔

"تو آپ نے اپنے کو کیوں ظاہر کیا؟" مالتی نے تھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے خود نہیں معلوم۔ لیکن میں اپنے آپ کو روک نہ سکی"

مالتی یہ کہنے ہی کو تھی کہ "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے اس راز کو مجھ پر ظاہر کر دیا ورنہ میں اپنی ماں کو کیسے پہچانتی" لیکن فوراً ہی دل کی آواز نے اُسے پکارا "کیا سوچتی ہے؟ ایسی ناپاک ماں۔ بہتر تھا کہ اسکی کبھی صورت بھی نہ دیکھی جاتی"

مالتی کی آنکھیں چمک اُٹھیں، بالکل اُسی طرح جیسے پاگلوں کی آنکھیں بعض وقت چمکنے لگتی ہیں۔ وہ تلخ خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئی۔

گاڑی کا وقت قریب آگیا تھا۔ قلی، جیسا کہ پہلے طے پا چکا تھا، سامان لینے کے لئے آیا۔

"آپ ان جواہرات کو لیتی جائیں۔ میں انھیں نہیں پہن سکتی" مالتی نے کہا

بیوہ نے مالتی کے چہرہ پر نگاہ ڈالی۔ اُس نے معلوم کیا کہ اسوقت اِس کے دماغ میں کس نوع کی باتیں چکر لگا رہی ہیں۔

"جیسا تم خیال کرتی ہو، وہ بات نہیں ہے۔ تم اِن چیزوں کو بلا تامل استعمال کر سکتی ہو۔ اگر ان کی حقیقت کچھ اور ہوتی تو میں انھیں تمھیں دینے کے بجائے دریا میں پھینک دیتی۔ اپنی زندگی کے صرف ایک گناہ کی پاداش میں، میں نے یہ تمام اذیتیں جھیلی ہیں اور کامل چودہ سال میں نے اس کا کفارہ ادا کیا ہے۔ یہ جواہرات میری سیاہ کاری کا نتیجہ نہیں ہیں۔ میرے باپ ایک دولتمند آدمی تھے اور اُنھوں نے شادی کے وقت مجھے یہ چیزیں دی تھیں"

"لیکن پھر بھی میں شوہر سے دریافت کئے بغیر انھیں نہیں استعمال کر سکتی"

"ہاں۔ تم اُن سے پوچھ لو۔ اگر بالفرض وہ تمھیں اِس کی اجازت نہ دیں تو تم ان چیزوں کو فروخت کر کے کسی مندر میں اِس کے روپئے دیدینا"

ماں جانے لگی۔

مالتی کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ خون کے جوش سے وہ بالآخر مجبور ہو گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے ماں کے قدموں کو پکڑ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُسی عالم میں اس کی زبان سے صرف یہ الفاظ نکل سکے۔ "ماما۔ پھر آنا"

"خوش رہو۔ خدا تمھیں عافیت دے اور چین سے زندگی گزارو" ماں نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔ اور ایک لمحہ کے بعد وہ موجود نہ تھی۔

(ماخوذ از بنگلہ)

پربھت کمار مکرجی

ظہیر الدین حیدر، نیر آروی

اگر آپ روحانیات سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو "جن" کے پرچے مطالعہ کیجئے۔
فی پرچہ اصل قیمت ۸ رعایتی ۴ر علاوہ محصول۔ منیجر نگار - لکھنؤ

لامذہبیات

یعنی

(مذہب ایک لامذہب کے نقطۂ نگاہ سے)

علم و مذہب کی جنگ کوئی نئی چیز نہیں اور نہ ہم اسے فطرت کے خلاف کہہ سکتے ہیں، کیونکہ مذہب کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اُسے بلا چون و چرا تسلیم کر لینا چاہئے اور اہل علم کی حجت یہ ہے کہ جب تک کوئی بات سمجھ میں نہ آ جائے اس پر یقین لانا ممکن نہیں۔ اہل مذاہب اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ عقل انسانی بہت ناقص ہے اور اس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی کامل شے کا تصور کر سکے۔ فریق ثانی کہتا ہے کہ جس چیز کو تم "شئے کامل" سے تعبیر کرتے ہو اسی کا ثبوت تمہارے پاس کیا ہے۔ کہ ہماری عقل ناقص کو اس کے سمجھنے سے باز رکھتے ہو۔ الغرض اہل علم و اہل مذہب کی یہ نزاع بہت قدیم چیز ہے اور باختلاف نوعیت اب بھی اسی طرح بلکہ زیادہ شدت کے ساتھ نظر آتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے حکومت و مذہب دونوں ایک چیز تھے اور اس لئے اہل مذاہب بزور شمشیر اپنے مخالفین کو خاموش کر سکتے تھے، اب ایسا نہیں کر سکتے اور معاندین مذہب کی جماعت بڑھتی جا رہی ہے۔ یورپ اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ میں جہاں خدائے قادر مطلق کے بجائے Almighty Dollar کی پرستش کی جاتی ہے الحاد نہایت تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور اہل کلیسہ حیران ہیں کہ "آسمانی بادشاہت" کے وجود کو کیونکر قایم رکھ سکیں۔

ہندوستان میں بھی یہ رو کافی تیزی کے ساتھ دوڑ رہی ہے اور یہاں کے حلقہ ہائے مسجد و خانقاہ میں بھی ان کفر سامانیوں کو نہایت تشویش کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے لیکن اسوقت تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس طوفان سے بچنے کی صورت کیا ہے۔

اہل مذہب کی طرف سے جو تدبیر دفاع اختیار کی جاتی ہے وہ زیادہ تر اس لئے بے اثر رہتی ہے کہ انہیں یہی معلوم نہیں کہ ملاحدہ کہتے کیا ہیں اور وہ کن دلایل کی بناء پر خدا اور مذہب سے انکار کرتے ہیں۔

مریکہ وغیرہ میں تو اہل مذہب اُن کے لٹریچر کو شاید کبھی پڑھ لیتے ہوں، لیکن ہندوستان میں تو اس کا دیکھنا ہی گناہ سمجھا جاتا ہے اور اس لئے یہاں کے اہل مذہب قطعاً ناواقف ہیں کہ اس زمانہ کا الحاد کس قسم کا الحاد ہے اور اس کے مقابلہ کے لئے کن نئی تیاریوں کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں میں اس وقت صرف دو چار رسایل ایسے ہیں جنھوں نے اپنا مقصود الحاد کی مخالفت اور اسلام کی حمایت قرار دے رکھا ہے، لیکن حقیقتاً ان میں کوئی ایک رسالہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس بیسویں صدی کے منکرین خدا کو خاموش کر سکے اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ جو راہ انھوں نے خدمت اسلام اختیار کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ بالکل غلط ہے بلکہ اور زیادہ دہریت پھیلانے والی ہے کیونکہ اگر ہم کسی کی بات نہ سنیں اور اپنی ہی کہے جائیں تو ظاہر ہے کہ ہم کو بہرا ہی سمجھا جائے گا۔ پھر چونکہ پیروان اسلام اپنے مذہب کو سب سے زیادہ مکمل اور عین فطرت کے مطابق کہتے ہیں اس لئے اس کی طرف سے جب اس نوع کی جاہلانہ کوششیں دیکھتا ہوں تو مجھے سخت حیرت ہوتی ہے۔

علماء اہل اسلام کی طرف سے ایک عام طریقہ جواب کا یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ مذہب کے خلاف جو اعتراض کئے جا رہے ہیں وہ نئے نہیں ہیں بلکہ بہت پرانے ہیں اور ان کا جواب دیا جا چکا ہے۔ اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ ان پرانے اعتراضات کو بھی کبھی دفع کیا گیا ہے یا نہیں اور اگر اسے مان بھی لیں تو انھوں نے یہ کیونکر جان لیا کہ موجودہ ذہنی انقلاب وہی ہے جو اس سے پہلے پایا جاتا تھا اور اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے

اگر اہل مذہب واقعی الحاد کا سد باب کرنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض یہ ہے کہ پہلے ملحدین کے بیانات کو سنیں، بغیر کسی جذبۂ غیظ و انتقام کے ٹھنڈے دل سے سنیں اور پھر غور کریں کہ اُن کے دلایل کا کوئی مسکت جواب اُن سے ممکن ہے یا نہیں۔ صرف گالیاں یا بد دعائیں دینے سے کام نہیں چلتا، چنانچہ میں آج کی صحبت میں بتانا چاہتا ہوں کہ ایک لا مذہب (انگرسول) کا زاویۂ نگاہ مذہب کے باب میں کیا ہے اور یہ سلسلہ آیندہ بھی جاری رہیگا تاکہ اہل مذہب کو معلوم ہو جائے کہ دنیا میں الحاد پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں اور پھر اگر ممکن ہو تو اس کا علاج سوچا جائے۔ ضرورت ہے کہ ملحدین کے ان شکوک و اعتراضات کو دور کیا جائے جو اُن کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور اس لئے اگر اس دوران میں کوئی جوابی و اصلاحی مقالہ کسی کی طرف سے موصول ہوا تو وہ بھی ساتھ ہی ساتھ شائع ہوتا رہیگا۔ مجھے امید ہے کہ قارئین نگار نہایت ٹھنڈے دل سے بغور اس سلسلہ کا مطالعہ کریں گے۔

مذہب کیا ہے

"خدا ہی نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں اور وہی ان کا مدبر ہے اس لئے مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے

خالق کا مطیع رہے، یعنی اگر اس کی طرف سے کوئی حکم نافذ کیا جائے تو اس کی تعمیل کرنا ہر شخص پر لازم ہے"

یہ ہے اصل مفہوم مذہب کا جو صدیوں سے رائج چلا آتا ہے اور تمام قوموں نے اسی اعتقاد کے ماتحت یقین کر لیا کہ خدا ہم سے قربانیاں چاہتا ہے، چنانچہ اول اول لوگوں نے اپنی اولاد تک کو بھینٹ چڑھانے سے عذر نہ کیا اور پھر صرف بیل، بھیڑ، بکری کے خون سے خدا کو راضی رکھنے کی کوشش کی گئی کیونکہ وہ اگر ایسا نہ کرتے تو خدا اُن کی فصلیں خراب کر دیتا، پانی برسانا بند کر دیتا، بیماریاں پھیلاتا، زلزلے لاتا اور قحط و وبا کی مصیبت میں مبتلا کر دیتا۔ اس اعتقاد قربانی کی آخری جھلک عیسوی مذہب میں بھی پائی جاتی ہے اور اسلام میں بھی۔ وہاں خدا، اپنے بیٹے کی قربانی قبول کر کے ہمیشہ کے لئے چین سے بیٹھ گیا اور یہاں ابراہیم خلیل اللہ کے تہیۂ قربانی سے خوش ہو کر آیندہ کے لئے صرف جانوروں کی قربانی پر راضی ہو گیا۔

اہل مذاہب کا یہ اعتقاد بھی بہت قدیم ہے کہ خدا ہماری التجائیں سنتا اور ان کو پورا کرتا ہے۔ اس لئے اب اہم اعتقادات کو پیش نظر رکھ کر قدرتاً چند سوال پیدا ہوتے ہیں جو اصل بنیاد ہیں لامذہبیت کی اور چونکہ اسوقت تک اہل مذہب کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکے ہیں اس لئے ملحدین خود ہی اس سے ایک نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں اور اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

شبہات ملاحظہ ہوں:۔

کیا مذہب کی بنیاد کسی حقیقت معلومہ پر قایم ہے؟

کیا واقعی کوئی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جسے خدا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے؟

کیا واقعی خدا ہمارا تمہارا خالق ہے؟

کیا واقعی اس نے کبھی ہماری دعاؤں کو سنا ہے؟

کیا واقعی قربانیوں سے خوش ہو کر اس نے کسی قوم کے ساتھ کوئی خاص رعایت روا رکھی ہے؟

(۱) اگر واقعی اسی نے انسان پیدا کیا ہے تو کیوں ایسے افراد اس نے پیدا کئے جو مسخ و قبیح ہیں، مفلوج و محتاج ہیں اور ذہنی حیثیت سے حد درجہ پست۔

مجرموں، دیوانوں اور بے عقل لوگوں کو پیدا کرنے میں اس کی کیا مصلحت تھی۔ کیا کوئی ایسی قوت کی طرف سے جسے فراست کل اور قوت مطلق کہتے ہیں، ان نقایص تخلیق کی کوئی معقول توجیہ پیش کی جا سکتی ہے؟

(۲) اگر خدا تمام اُمور عالم کا مدبّر و منظم ہے تو کیا وہ ان بادشاہوں کے افعال کا ذمہ دار نہیں ہے جنھوں نے دنیا میں سوائے ظلم کے اور کچھ نہیں کیا؟

کیا وہ ان تمام لڑائیوں کا ذمہ دار نہیں ہے جن میں لاکھوں بیگناہوں کا خون بہایا جاتا ہے؟

کیا وہ دورِ غلامی اس کی مرضی کے موافق نہ تھا جب صدیوں تک ہزاروں بیگناہ انسانوں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان بنی رہی اور بے شمار ماؤں کے مضطرب سینوں سے اُن کے بلکتے ہوئے بچے جدا کرکے قتل و ذبح کردئے گئے۔

کیا وہ اُن مذہبی تعذیبات کا ذمہ دار نہیں جو بیگناہ انسانوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونکدینے اور شکنجے میں تان تان کر ایک ایک جوڑ علیٰحدہ کردینے پر مشتمل تھے۔

خدا نے کیوں ظالموں اور بدکرداروں کو مہلت دی کہ وہ بہادروں اور نیک کرداروں کو پامال کریں۔ خدا نے کیوں کافروں کو اس کا موقعہ دیا کہ اس کے خاص بندوں کو عذاب میں مبتلا کریں۔ اگر ایک رحم و کرم والا خدا واقعی کائنات کا مدبر ہے تو یہ آئے دن کے طوفانوں، زلزلوں، وباؤں اور خشک سالیوں کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ سل و دق، سرطان و خناق اور اسی طرح کی سیکڑوں بیماریاں پیدا کرنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے جن سے نہ معصوم بچے جانبر ہو سکتے ہیں نہ زاہد و مرتاض انسان۔

درندوں کا انسانوں کو پھاڑ کر کھاتے رہنا۔ زہریلے سانپوں کا لوگوں کو ڈستے رہنا، اور خدا کا کچھ نہ کہنا، عجیب معمہ ہے۔

کیا اس نے ناخن و چنگال اسی لئے پیدا کئے کہ وہ گوشت کے ریشے جدا کرتے رہیں، کیا اس نے پر و بال اسی لئے بنائے ہیں کہ معذور و بیکس آسانی سے گرفت میں آسکیں، کیا اس نے جراثیم اسی لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ انسانوں کو اندھا، کوڑھی، مسلول و مدقوق بنا کر اپنی بھوک مٹاتے رہیں۔

کیا کائنات کی تنظیم اسی طرح ممکن تھی کہ ایک جاندار کی زندگی دوسرے جاندار کے گوشت و خون پر منحصر ہو، اور کیا تدبیر عالم یہ آہ او رکراہ کا ہنگامہ پیدا کئے بغیر محال تھی؟ پھر ان واقعات و حالات پر غور کرو اور سمجھو کہ مذہب کیا ہے؟

وہ نام ہے صرف ایک بے بنیاد خوف کا — ایک خوف جو خود ہی ایک قربانگاہ بناتا ہے اور خود ہی اس پر قربانیاں چڑھاتا ہے۔ خود ہی ایک معبد طیار کرتا ہے اور خود ہی وہاں جھک جاتا ہے۔

مذہب ہمیں وہی باتیں سکھاتا ہے جو صرف ایک غلام ہی کے لئے موزوں ہیں — اطاعت، فرمانبرداری نفس کشی، صبر و تحمل، عدم مقاومت اور اپنے آپ کو مٹا دینا۔

خود مختاری، سرفرازی، خود اعتمادی، جرأت و اقدام کا وہاں کوسوں پتہ نہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ خدا مالک ہے اور انسان اس کا غلام، لیکن مالک چاہے کتنا ہی بڑا ہو غلامی کو خوشگوار نہیں بنا سکتا۔

اگر خدا کا وجود ہے تو ہم کیونکر جان سکتے ہیں کہ وہ رحم و کرم والا بھی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ لاکھوں کروڑوں غریب و جفاکش انسان ہل چلا رہے ہیں، کھیتیاں بو رہے ہیں اور ان کی زندگی کا انحصار صرف اسی محنت پر ہے لیکن وہ پانی نہیں برساتا، کھیتیاں مرجھا رہی ہیں لیکن پانی کا ایک قطرہ نہیں گراتا، کروڑوں انسان اپنی مایوس و منتظر آنکھوں سے آسمان کو دیکھ رہے ہیں لیکن سوائے جھلسا دینے والے آفتاب کے بادل کا ایک ٹکڑا بھی انھیں کسی جگہ نظر نہیں آتا۔ خدا اُن کے دل کے اضطراب کو دیکھتا ہے اور رحم نہیں کھاتا اُن کی اشک آلود آنکھوں کو دیکھتا ہے اور خاموش ہے۔ بچے ماؤں کی خشک چھاتیوں سے لگے ہوئے بلک رہے ہیں اور دودھ نہیں پاتے، مائیں آنچل پھیلا پھیلا کر اپنے بھوکے بچوں کا واسطہ دے دیکر دعائیں مانگ رہی ہیں، لیکن کوئی سننے والا نہیں۔ پھر کیا خدا کا رحم و کرم ثابت کرنے کے لئے بادِ سموم کے اُن جھونکھوں کو پیش کیا جاسکتا ہے جو بستیوں کی بستیاں تباہ کر جاتے ہیں اور میدانوں کو لاشوں سے بھر دیتے ہیں۔ کیا اس کی شفقت و محبت کے ثبوت میں زلزلوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ جب زمین ہزاروں انسانوں کو نگل جاتی ہے کیا آتش فشاں پہاڑوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ جن کے شعلے بچے بوڑھے کی بھی تمیز نہیں کرتے۔

کیا اگر یہ تباہکاریاں نہ پائی جائیں تو ہم کو یہ شک کرنے کا موقع ملیگا کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے غافل ہے کیا اگر زلزلہ و طوفان، قحط و وبائی مصیبتیں نازل نہ ہوں تو ہم کو یہ کہنے کا موقع ملیگا کہ خدا مہربان نہیں ہے۔

الٰہیات والے کہتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو یکساں پیدا نہیں کیا، اس نے قد و قامت، رنگ و صورت، ذہن و فراست کے لحاظ سے قوموں کو ایک دوسرے سے ممتاز کر دیا ہے۔ تو کیا بلند قوموں کو خدا کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ اس نے انھیں پست نہیں بنایا۔ یقیناً شکر کی بات ہے۔ لیکن اس صورت میں کیا پست قومیں اس بات کا شکریہ ادا کریں گی کہ خدا نے انھیں جانور نہیں بنایا؟

جب خدا نے بلند و پست قوموں کو بنایا تھا تو کیا یہ بات اس کے علم میں نہ تھی کہ بلند قومیں پست قوموں کو اپنا غلام بنائیں گی، ان کو ایذائیں پہونچائیں گی اور تباہ و برباد کردیں گی۔

کیا وہ نہ جانتا تھا کہ یہ بلند و پست کا امتیاز دنیا میں کتنا خون بہائے گا، نوعِ انسانی کو کن کن مصائب میں مبتلا کرے گا، کتنے میدان لاشوں سے پاٹ دیگا، کتنے غلاموں کے جسم کا گوشت کوڑوں کی ضرب سے پارہ پارہ کرے گا، اور کتنی ماؤں کے دل اُن کے بچے جدا کرکے تڑپائے گا۔ پھر اگر یہ سب کچھ اس کے علم میں ہوا تو کیا اس کا رحم و کرم اس سے زیادہ دلدوز مناظر کا منتظر تھا۔

وہ قیدخانے جن کی سنگین دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر دنیا کے بہت سے بلند اخلاق والے انسانوں نے اپنی جانیں دیدیں، وہ سولیاں جو مقدس انسانوں کے خون سے رنگین بنائے جانے کے لئے نصب کی گئیں

وہ غلاموں کی جماعتیں جن کی پیٹھ کے زخموں کو خشک ہونے کا کبھی موقعہ نہیں دیا گیا، وہ مقدس ہستیاں جن کا ایک ایک جوڑ شکنجہ میں تان تان کر علٰحدہ کیا گیا، جن کی کھالیں کھنچوا کھنچوا کر بھس بھروا یا گیا، وہ بیشمار انسان جو قحط و وبا کا شکار ہوئے، جن کو زمین نے نگل کر ڈکار تک نہ لی، جن کو سانپوں نے ڈسا، آتش فشاں پہاڑوں نے جھلسایا۔ اور وہ لاتعداد بدکار ظالم انسان جنھوں نے دنیا میں تمام مظالم توڑے اور کامیاب زندگیاں بسر کیں۔ کیا یہ اور اسی طرح کے تمام سمجھ میں نہ آنیوالے واقعات رحم و کرم والے خدا کے علم سے باہر تھے اور کیا یہ سب کچھ بغیر اس کی مرضی کے ہوا؟

انسان نے ہمیشہ کسی نہ کسی مافوق الفطرت ہستی کا دامن پکڑنا پسند کیا۔ اگر اس نے پتھر کو پوجنا چھوڑا تو ایک اور غیر معلوم قوت کے سامنے جھک گیا۔ جس کو وہ صحیح راہ دکھانے والا باور کرتا ہے لیکن حقیقت کیا ہے؟

انسان فطرتاً اقدام پسند واقع ہوا ہے، وہ ہمیشہ آگے قدم بڑھاتا ہے اور تجربات اس کو بتاتے ہیں کہ اس نے جو قدم اٹھایا تھا وہ صحیح تھا یا غلط۔

ایک آدمی کسی جگہ کا ارادہ کرکے چل پڑتا ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ پہونچتا ہے جہاں دو راستے پھٹتے ہیں، وہ بایاں راستہ اختیار کر لیتا ہے لیکن اسے کچھ دور چل کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستہ غلط تھا، وہ واپس آتا ہے اور داہنے ہاتھ کا راستہ اختیار کرکے منزل تک پہونچ جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس جگہ پہونچنے میں غلطی نہیں کرتا اور ہمیشہ سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قوت نے کیا رہنمائی اس کی کی۔

ایک بچہ شعلہ کی چمک دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور جل جاتا ہے اس کے بعد پھر یہ جرأت وہ کبھی نہیں کرتا۔ تو کیا یہ سبق اس کو اسی قوت نے دیا یا خود اس کے تجربہ نے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے تجربات میں خود وہ قوت پنہاں ہے جو صحیح راستہ بتانے والا ہے، یہ قوتِ ادراک و ارادہ سے بالکل معرّا ہے، اور اس کا نام ہے تجربہ۔

بہت سے لوگ ضمیر اور احساس اخلاق کے وجود کو، وجود خدا کی دلیل بتاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان طبعاً تمدن پسند واقع ہوا ہے اور خانوادوں، قوموں اور قبیلوں کی صورت میں ہمیشہ زندگی بسر کرتا چلا آیا ہے۔ پھر قبیلہ کے جن افراد نے خاندانی و عائلی مسرتوں میں اضافہ کیا وہ اس کے اچھے اعضا شمار کئے گئے اور جنھوں نے تکلیفیں پہونچائیں انھیں بُرا سمجھا گیا اور یہیں سے اخلاق کے اچھے بُرے ہونے کا معیار قائم ہوا۔

وحشی قوموں میں ہمیشہ فوری نتائج پر غور کیا جاتا ہے، لیکن ترقی یافتہ قوموں میں نتائج بعیدہ کو سامنے

رکھا جاتا ہے اور اس طرح اخلاق کا معیار بلند تر اور فرض شناسی کا احساس قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں کسی مافوق الفطرت قوت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

مذہب کیا ہے؟ انگرسول عیسوی مذہب کو سامنے رکھ کر پوچھتا ہے کہ عیسویت نے دنیا کو کیا فائدہ پہونچایا جب اس کا اقتدار قائم تھا تو کیا اس نے انسان کو زیادہ بہتر انسان بنایا۔ اس کا اثر اطالیہ، اسپین، پرتگال اور آئرلینڈ پر کیا ہوا۔ ہنگری اور آسٹریا کو کیا فائدہ اس سے حاصل ہوا۔ انگلستان، امریکہ، ہالینڈ و اسکاٹلینڈ نے کیا تمتع اس سے حاصل کیا۔ اگر عیسویت کے سوا وہ کسی اور مذہب کے پیرو تھے تو کیا وہ خراب ہو گئے تھے۔

اگر ٹورکیمڈا، زردشتی مذہب کا پابند ہوتا تو کیا اور زیادہ خراب انسان ہوتا۔ کیا کالون اور زیادہ خونخوار بن جاتا اگر وہ یہودی ہوتا، کیا ڈچ اور زیادہ احمق ثابت ہوتے اگر وہ تثلیث مسیحیت کے قائل نہ ہوتے، کیا جان ناکس اور زیادہ بڑے اخلاق کا ہو جاتا اگر بجائے مسیح کے وہ کنفوشس کا ماننے والا ہوتا۔

مذہب کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں بہت کافی تجربہ ہو چکا ہے اور اب اس کی ناکامی پر مزید حجت پیش کرنے کے لئے کسی اور جدید تجربہ کی ضرورت نہیں ہے۔

مذہب کبھی انسان کے دل میں جذبہ رافت و الفت پیدا نہیں کر سکا اور اس کے ثبوت میں مذہبی تاریخ کے وہ اوراق پیش کئے جا سکتے ہیں جن کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے۔

مذہب، علم و تحقیق کا ہمیشہ دشمن رہا ہے اور اس نے کبھی ذہنی آزادی کا ساتھ نہیں دیا۔

مذہب کبھی انسان کو محنتی، جفاکش اور ایماندار بنانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ چنانچہ وحشی اقوام کی برائیوں کا سبب صرف ان کی مذہبی واہمہ پرستی ہے۔

وہ لوگ جو فطرت کی یکسانیت کے قائل ہیں ان کے لئے مذہب کا خیال کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

کیا انسان، فطرت اور صفاتِ مادہ کو اپنی دعاؤں سے متاثر کر سکتا ہے، کیا ہم طوفانوں کو پوجا پاٹ کے ذریعہ سے کم و بیش کر سکتے ہیں، کیا ہم قربانیاں پیش کر کے ہواؤں کا رخ بدل سکتے ہیں، کیا ہم الحاح وزاری سے بیماری کا علاج کر سکتے ہیں۔ کیا عزت و سربلندی ہمیں بھیک مانگنے سے مل سکتی ہے؟

وہ چیز جسے ہم نفس کہتے ہیں کیا وہ قانون قدرت کا اسی طرح پابند نہیں جس طرح ہمارا جسم؟

مذہب کی بنیاد اس خیال پر قائم ہے کہ عالم فطرت کا کوئی ایک مالک ہے جو دعاؤں کو سنتا ہے، اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے اور جزا و سزا دیتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ واقعات کی دنیا میں کوئی

ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ہمیں ان اعتقادات کی تصدیق ہوسکے۔

جب ہم کوئی نظریہ قایم کرتے ہیں، تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی بنیادی حقیقت ضرور ہوا کرتی ہے، محض وہم وقیاس پر کوئی اُصول مرتب نہیں ہوسکتا، اس لئے اگر ہم لامذہبیت کا نظریہ پیش کرتے ہیں تو اسکے لئے چند بنیادی حقایق بھی اپنے پاس رکھتے ہیں۔

مثلاً ایک یہ کہ مادہ و قوت فنا نہیں ہوسکتے، دوسرے یہ کہ مادہ و قوت ایک دوسرے سے علحدہ نہیں ہوسکتے، تیسرے یہ کہ جو چیز غیر فانی ہے وہ غیر مخلوق ہے، قدیم ہے۔

دُنیا میں ذہانت و ذکاوت کا وجود صرف قوت کے وجہ سے ہے اور قوت بغیر مادہ کے ممکن نہیں اس لئے معلوم ہوا کہ ذکاوت صرف قوت و مادہ کی ممنون ہے اور اس باب میں کسی ایسی مافوق الفطرت ہستی کے تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں جسے مدبّر کائنات کہا جائے۔

اگر مادہ و قوت ازلی و ابدی ہیں تو جو کچھ ممکنات میں تھا وہ واقع ہوا، جو ممکنات میں ہے وہ ظاہر ہو رہا ہے اور آیندہ بھی رونما ہوتا رہیگا۔ کائنات میں اتفاق کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہوتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور پایا جاتا ہے۔ جس چیز کو ہم حال کہتے ہیں وہ ماضی کی پیداوار ہے اور جس کا نام مستقبل ہے وہ نتیجہ ہوگا حال کا جو کچھ نہیں ہوا ہے وہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، اور جو ہو چکا ہے اس کا ہونا لازم تھا۔ سیاروں کی تخلیق و گردش سے ایک رینگنے والے کیڑے کی حرکت تک سب اسی قانون سے جکڑے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف کسی بات کا ظاہر ہونا ناممکن ہے۔

ہزاروں سال سے دنیا کی اصلاح کی کوشش جاری ہے اور اس غرض کے لئے دیوتا، دیویاں، بہشت و دوزخ، الہامات و معجزات، کلیسا و خانقاہ، قید خانے اور شکنجے، سیکڑوں چیزیں پیدا کی گئیں، ایک بادشاہ کو تخت سے اُتار کر دوسرے کو بٹھایا، ایک ملکہ کی گردن مار کر دوسری کو تخت نشین کیا، آدمیوں کو زندہ جلایا، فوجکشیاں کی گئیں، دعائیں مانگی گئیں، ڈرایا گیا، لالچ دی گئی، الغرض مذہب نے سبھی کچھ کیا لیکن مقصد آجتک پورا نہ ہوا۔ کیونکہ مذہب غلامی ہے ذہن و دماغ کی اور جب تک انسان کا ذہن آزاد و بیدار نہ ہو نوع انسان کی فلاح مجموعی حیثیت سے ناممکن ہے۔

یہاں، وہ خیالات اس زمانہ کے ملحد و لامذہب کے جو اخباروں، رسالوں اور لکچروں کے ذریعہ سے

تمام دنیا میں اشاعت پا رہے ہیں اور ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مقبول ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم دہریت و الحاد کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے ہیں تو ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دنیا کے اس ذہنی تشویش و تذبذب کو دور کریں۔ پھر اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ ہم منطق و فلسفہ کی پیچیدہ باتوں میں الجھا کر فریق مخالف کو خاموش کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اس طرح اسکی زبان تو بند ہو سکتی ہے لیکن دل مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ضرورت ہے اس مذہبی روح کی تلقین کی جو ظاہری شعائر و مراسم سے بے نیاز ہے اور جس میں سوائے بلند تعلیم اخلاق کے کوئی اور چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو ہمیں الہام و معجزات، بہشت و دوزخ، حشر و نشر، قیامت و آخرت کے تسلیم کرنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ یہی وہ تنگ نظری تھی جس نے اہل مذاہب کو ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رکھا اور یہی وہ چیز ہے جو مذہب کے اقتدار کو مٹا کر رہیگی۔ دنیا میں اب کوئی ایسا مذہب نہیں چل سکتا جو تمدنی ضروریات، بین الاقوامی تعلقات، اقتصادی مشکلات، اخلاقی اصولِ عامہ کو پس پشت ڈالکر صرف "امید فردا" پر اپنی کارگاہِ تبلیغ قائم کرے۔ وہ وقت گزر گیا جب مذہب کسی ایک قوم کے لئے مخصوص ہوا کرتا تھا، اب کہ کرۂ زمین کی ۲۴ ہزار میل کی وسعت کو انسان چند دن میں طے کر لیتا ہے، تخصیص نسل و جغرافیہ کا سوال بالکل لایعنی چیز ہے اور مذہب کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ کوئی ایسا لائحہ عمل پیش کرے جو تمام آبادی کو کسی ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتا ہو اور یہ ممکن نہیں جب تک مذہب سے اعتقادی حصہ کو علٰحدہ کر کے اسے ہیئت اجتماعی کے اصول پر صرف "سوشل ارگنائزیشن" کی حیثیت نہ دیجائے۔

"نگار" کے پُرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل دفتر میں موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت پر مل سکتے ہیں جو اُن کے آگے درج ہے:-

(سنہ ۲۲ء) ستمبر ۴ر— سنہ ۲۳ء مئی ۴ر— (سنہ ۲۴ء) جنوری - فروری و اگست ۴ر فی پرچہ (سنہ ۲۶ء) جنوری جون، اکتوبر و نومبر ۴ر فی پرچہ— (سنہ ۲۷ء) اپریل - مئی و جون ۴ر فی پرچہ— (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر— (سنہ ۳۱ء) جولائی - اگست - ستمبر - اکتوبر - نومبر و دسمبر ۴ر فی پرچہ— (سنہ ۳۲ء) جنوری (غالب نمبر) ۱۲ر— فروری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴ر فی پرچہ— (سنہ ۳۳ء) فروری - جولائی و اکتوبر ۴ر فی پرچہ— (سنہ ۳۴ء) فروری تا مئی و اکتوبر ۶ر فی پرچہ— (سنہ ۳۵ء) جنوری (اردو شاعری نمبر) ۸ر—

مینیجر نگار لکھنؤ

سائنس کے اکتشافاتِ جدیدہ

۱۔

صدہا سال سے یہ خیال علماء میں رائج چلا آرہا ہے کہ مادہ تین صورتوں میں پایا جاتا ہے یعنی وہ رقیق ہوگا یا منجمد یا دُخانی (گیسی) حالت میں۔ لیکن فلکیات کے ماہرین کی جدید تحقیقات کے سلسلہ میں معلوم ہوا ہے کہ مادہ کی چوتھی صورت اور بھی ہے، یعنی یہ کہ اس کے ذرات بھُر بھُری حالت میں بھی پائے جاتے ہیں جس کا نام انھوں نے "سفوفی ذرات" رکھا ہے۔

فضا میں جتنے سیارے اس سفوفی حالت میں پائے جاتے ہیں وہ دریافت ہو چکے ہیں جن کا نام انھوں نے سفید بونے یا "اقزامِ سفید" (WHITE DWARFS) رکھا ہے۔ اس تسمیہ کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت چھوٹے ہیں اور شعاعوں کی کثرت سے بالکل سفید معلوم ہوتے ہیں۔

ان میں غیر معمولی حرارت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ حال ہی اس سلسلہ کا ایک سیارہ دریافت ہوا ہے اس کی بالائی سطح کا درجۂ حرارت ۱۱۰۰۰ ڈگری ہے یعنی آفتاب کی حرارت سے بھی دو چند۔

ان میں سب سے چھوٹا سیارہ وہ ہے جسے امریکہ کے مشہور ہیئت داں کوپر نے گزشتہ سال دریافت کیا ہے۔ اس کی جسامت کو سورج کی جسامت سے وہی نسبت ہے جو ایک کو ۸۰ لاکھ سے ہے۔ اس کا ثقل پانی سے ۳۰۰۰۰۰۰ گنا زاید ہے یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اس کے ایک مکعب انچ کا وزن ۶۲۰ ٹن ہے۔ اگر سوئی کی نوک کے برابر اس کا ایک ذرہ کسی انسان پر گر پڑے تو سُرمہ کر کے رکھدے۔

اس کا درجۂ حرارت ۲۸۰۰۰ ڈگری ہے اور اسی لئے اس کے ذرات سے پیدا ہونے والی گیس اتنی وزنی ہوتی ہے کہ اگر ٹینس کا ایک گیند اس سے بھر دیا جائے تو اس کا وزن ایک ہزار ٹن ہو جائے۔ اس کی کشش ثقل اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اس زمین کا ایک انسان جس کا وزن گیارہ اسٹون کا ہے وہاں پہونچکر ۶۲۵۴۲۵ ٹن کا ہو جائے گا اور یہ کشش ثقل اتنی زبردست ہے کہ وہ فوراً پانی کی طرح رقیق ہو کر بہ جائے گا۔

سورج کے ہر مربع انچ سے پچاس گھوڑوں کی طاقت ہر وقت خارج ہوتی رہتی ہے لیکن اس سیارہ کے ہر مربع انچ سے ۳۰ ہزار گھوڑوں کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔

ان سیاروں کی قوت آہستہ آہستہ گھٹتی رہتی ہے یہاں تک کہ ان کا اشعاع (RADIATION) زایل ہو جاتا ہے اور وہ ایک بڑے تاریک ذرہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

۲ — حال کی تحقیقات سے بعض ماہرین سائنس اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ہم نسبتاً خلا کے ایک بہت خالی کونے میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ستاروں کا قریب ترین جھنڈ، کرۂ زمین سے ۲۶ ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے پیچھے ہٹتا جا رہا ہے۔

انشٹین کا سابق نظریہ کہ خلا میں چونکہ انحنا پایا جاتا ہے اس لئے لامتناہی نہیں ہے، معرض بحث میں آ گیا ہے یہاں تک کہ خود انشٹین بھی مشتبہ ہو گیا ہے۔ اگر انشٹین کا یہ نظریہ صحیح ہو تو خلا کی وسعت صرف آٹھ گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے لیکن جدید تحقیقات سے یہ وسعت اور زیادہ پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اس لئے وہ فضا میں انحنا کے خیال سے ہٹتے جاتے ہیں۔

کائنات کی عمر کے متعلق بھی جدید اکتشافات ہوئے ہیں۔ کچھ زمانہ قبل بعض نے یہ خیال قایم کیا تھا کہ سیاروں کی عمر کا اندازہ کروروں نہیں بلکہ ارب اندر ارب سالوں کو سامنے رکھ کر کرنا چاہئے۔ کرۂ زمین کی عمر کا پتہ چٹانوں سے چلایا جاتا ہے اور اس طرح اس کی عمر دو ارب سال معلوم ہوتی ہے لیکن جو شہاب ثاقب زمین پر آ کر گرتے ہیں ان کے امتحان سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف زمین بلکہ تمام نظام سیارگان کی عمر اتنی ہی ہے۔

۳ — زمین کا گزشتہ کارڈ اس وقت تک جتنا معلوم ہوا ہے وہ صرف ۱۶۰۰۰ سال قبل کا ہی یعنی اسوقت تک کا جب ڈنمارک، جرمنی اور پولینڈ اول اول برفستان سے نمودار ہوئے۔ لیکن علماء طبقات الارض برابر تحقیقات میں لگے ہوئے ہیں۔

عہد ثلجی (برف) ایک ایسی دیوار ہے جس سے آگے بڑھنے کی کوئی صورت اس وقت تک پیدا نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ گرین لینڈ کے اوپر جو غلاف برف پڑا ہوا ہے اس کی چھان بین سے بھی کوئی زیادہ مفید مطلب بات معلوم نہیں ہوئی۔

مصنوعی زلزلے پیدا کر کے اس غلاف برف کا عمق معلوم کیا جا رہا ہے۔ اور اس طرح اندر کی طرف جن چٹانوں کا پتہ چلا ہے ان میں مختلف لچک پائی جاتی ہے۔ بعض چٹانیں بالکل خشک دریافت ہوئی ہیں اور بعض بالکل تر۔

اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زمین کے اندر فراہمی آب کے خزانے کہاں اور کن صورتوں میں پائے جاتے ہیں اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو اصحاب علم و سیاست دونوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔

بعض تحقیقاتی پارٹیاں، جو نیو گامنا اور پاپوا کی طرف اسی سلسلہ میں گئی تھیں وہ اتفاقاً بعض ایسی قوموں

سے بھی دو چار ہوئیں جو ہنوز عہد حجری کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

چار مہمیں قطب جنوبی کی طرف حال ہی میں روانہ ہوئی تھیں۔ ان کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی ایسی بیماریاں جو کرۂ ارض کے آباد علاقوں میں ناقابل علاج سمجھی جاتی ہیں یہاں از خود دور ہو جاتی ہیں۔ یقیناً وہ زمانہ دور نہیں ہے جب قطب جنوبی کے جامد حصے انسانی آبادی کے لئے کھل جائیں گے اور وہاں زندہ رہنے کے ذرائع ہاتھ آجائیں گے۔

۴ــــ علمائے نفسیات کی یہ جدید ترین تحقیق بہت حیرت سے دیکھی جائے گی کہ بعض ایسی بیماریاں جو صحت انسانی کو بالکل غارت کر دینے والی ہیں، مثلاً۔ سوء ہضم۔ غدود حلق کی خرابی۔ پائیریا وغیرہ۔ ان کا کوئی اثر انسان کی ذکاوت و ذہانت پر نہیں پڑتا۔

انسان کا ذہنی و دماغی نشو و نما جسمانی نشو و نما سے بالکل علیحدہ ہوتا رہتا ہے اور جب تک نظام عصبی کو متاثر کرنے والی بیماری پیدا نہ ہو ذہنی نشو و نما بدستور ہوتا رہتا ہے۔

دوسری عجیب تحقیق یہ ہے کہ سال کے جس موسم میں انسان پیدا ہوا ہی وہی موسم اس کی دماغی حالت پر بہت اثر انداز ہوتا ہی چنانچہ سترہ ہزار لڑکوں کی جانچ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ جو بچے جاڑے دن میں پیدا ہوتے ہیں وہ نسبتاً کم ذہین ہوتے ہیں۔

دنیا نظریہ "تاثر عادیہ" (CONDITIONED REFLEXES) سے واقف ہو چکی ہے جس نے پاولو، روس کے سائنس داں کو مشہور کر دیا۔ اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ عادتاً جو بات ہوتی رہتی ہی اس کا اثر بعض حالات بدل جانے کی صورت میں بھی وہی باقی رہتا ہے۔ مثلاً اگر کتا کھانے وقت کسی گھنٹی کی آواز سننے کا عادی ہو گیا ہے۔ تو پھر کھانا سامنے ہو یا نہ ہو محض اس گھنٹی کی آواز سنکر اس کے منہ میں پانی بھر آئے گا۔

اب جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ اس طریق سے جانوروں کو بیماری سے بھی محفوظ رکھا جا سکتا ہی اگر کسی جانور میں گھنٹی یا بگل بجا بجا کر دافع زہر دوا خون میں پہونچانے کے بعد زہر کی پچکاری دینے کی عادت ڈالدی جائے تو چند دن بعد یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ دافع زہر دوا دیجائے یا نہ دیجائے محض گھنٹی یا بگل کی آواز ہی زہر کے اثر کو دور کرنے والی ثابت ہوگی۔

ایک دوسرا انکشاف ماہرین نفسیات نے یہ کیا ہے کہ سیکھنے کی قوت انسان میں ۲۰ سال کے بعد کم ہونے لگتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ تجربہ بھی کیا گیا ہے کہ اگر مطالعہ کے بعد دیر تک گہری نیند لیجائے تو جو کچھ پڑھا ہے وہ حافظہ میں محفوظ رہتا ہے، اسی لئے رات کا مطالعہ ہمیشہ مفید سمجھا گیا۔

حافظہ خواہ وہ شعوری ہو یا نیم شعوری انسان کی زندگی پر بہت کچھ اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک لڑکے کو اس کی ۱۵ ماہ کی عمر سے یونانی زبان کا ایک ڈرامہ سنایا جانے لگا اور تین سال تک برابر یہی عمل جاری رہا۔ چھ سال بعد وہی حصے ڈرامے اس کو پڑھائے گئے جو اس کے سامنے دہرائے جاتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ حصے اس کو بہت جلد یاد ہو گئے اور جو حصے اس کے سامنے دہرائے نہیں گئے تھے ان کے یاد کرنے میں اسے بڑی دقت محسوس ہوئی۔

لیکن وہ کیا چیز ہے جو انسان کو یہ قوت عطا کرتی ہے، دماغ کی حقیقت کیا ہے اور وہ کیونکر کام کرتا ہے۔ ایک شخص کیوں فوراً اپنے اعضاء میں وہی جنبش پیدا کر سکتا ہے جو اس کا ارادہ ہے۔ یہ باتیں ہنوز زیر تحقیق ہیں اور ماہرین نفسیات کے ساتھ اطبار و کیمیاوئین بھی نظام عصبی کے اس عمل پر غور کر رہے ہیں۔

اسوقت تک اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ ایک عصب (NERVE) کی کیفیت بالکل برقی تار کی سی ہے اور جب دماغ کوئی حکم کسی خاص عضو کو دینا چاہتا ہے تو عصب کے ذریعہ سے مثل برقی تار کے اس عضو تک پہونچتا ہے لیکن درمیان میں اس حکم کو کئی اسٹیشنوں سے گزرنا ہوتا ہے اور ہر اسٹیشن پر ایک خاص کیمیاوی تغیر پیدا ہوتا ہے۔ ان تغیرات کا کافی مطالعہ ہو چکا ہے یہاں تک کہ ماہرین کہہ سکتے ہیں کہ ہر اسٹیشن پر کیا کیا کیمیاوی تغیرات پیدا ہوئے۔

سُرمہ کاجل چُورن منجن

اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کر کے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے۔

کاجل — آشوب سرخی ضعف بصارت کیلئے ازبس مفید ہے ایک ڈبیہ جو ایک شخص کے لئے سال بھر کو کافی ہے۔ قیمت عہ

سُرمہ — یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن میں طیار ہوتا ہے اس میں میرہ نہیں بلکہ معمولی سُرمہ ہے جس کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں طیار کیا جاتا ہے اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا دھند موتیابند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے۔ قیمت فی پڑیہ عہ علاوہ محصول

چورن — یہ وہ اکسیر چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد، قبض، نفخ ریاح کا پیدا ہونا، سوءِ ہضم دستوں کا آنا، سب یک لخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے، کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھا لینے سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول

منجن — اسکی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ اس سے ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول

(نوٹ) سب چیزیں منگانے والے کو محصول ڈاک معاف۔

پتہ :— م بیگم۔ ذریعہ رسالہ نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

صدیقی۔

کرمنامہ ملا۔ آیئے، شوق سے تشریف لایئے، لیکن یہ احسان رکھنے نہ آیئے کہ یہ زحمتِ سفر آپ نے صرف میری وجہ سے اختیار کی ہے۔ یہ تو اس سے کہئے جو آپ کی فطرت سے واقف نہ ہو۔

دل جائے دیگر است و نگہ جائے دیگر ست

اور ہاں، یہ دوسرے صاحب آپ کے ساتھ کون ہیں۔ میں ان سے بالکل واقف نہیں۔ دوست کا دوست دوست بھی ہو سکتا ہے اور دشمن بھی۔ اب خدا جانے مجھے ان کی پذیرائی دوست کی حیثیت سے کرنا ہوگی یا دشمن کی حیثیت سے۔ بہر حال اگر بر بنائے تکلف، ان کو یہاں قیام میں کوئی تکلیف ہوئی تو اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔

کرمفرمائے نیازمنداں۔

گرامی نامہ کے جواب میں غیر معمولی تعویق ہوئی، معافی چاہتا ہوں۔ میں کل ہی ایک طویل سفر سے واپس آیا ہوں اور آج صبح سب سے پہلے جو کام کیا ہے وہ یہ تحریرِ معذرت ہے۔

آپ نے جس مسئلہ میں میری رائے دریافت فرمائی ہے وہ اتنی پیچیدہ تو نہیں ہے کہ مجھے زیادہ غور کرنے کی ضرورت لاحق ہو، لیکن جی یہی چاہتا ہے کہ پہلے اعتکاف کروں اور پھر نماز استخارہ پڑھکر خواب میں ملہم غیب کی ہدایت کا منتظر رہوں۔ کیونکہ جب تک میں کوئی ایسی مافوق الفطرت سند پیش نہ کروں آپ کیوں ماننے لگے

قبلہ، آپ کس وہم میں پڑے ہوئے ہیں، میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اب پھر عرض کرتا ہوں کہ اس باب میں زیادہ پس و پیش کی ضرورت نہیں۔

ختمِ رسالت کے بعد فرشتے تو اب اس دنیا میں آنا ہو گئے ہیں بند، اس لئے لامحالہ آپ کو انھیں گنہگار آدمیوں میں سے کسی نہ کسی کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ پھر زیادہ سے زیادہ آپ یہی فکر کر سکتے ہیں کہ جسنے کم سے کم معصیت کی ہو وہ آپ کے ہاتھ آجائے ___ حالانکہ دنیا میں عقل معصیت ہی سے بڑھتی ہے۔

سو، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور میں کیا یقین دلاتا ہوں خود ان کی حماقتیں آپ کو باور کرادیں گی کہ وہ کافی سے زیادہ معصوم واقع ہوئے ہیں۔

میرا نظریہ اس باب میں آپ سے بہت مختلف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شوہر بننے کی صلاحیت انسان میں چالیس کے بعد پیدا ہوتی ہے جب وہ تمام گناہوں سے سیر ہو چکا ہو۔ صورت کا سوال چنداں اہم نہیں آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ خوبصورت بھی ہو، جوان بھی ہو اور اس پر طلب محال یہ کہ خیال و تصور میں بھی اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ سو، حضت، آپ کو ایسے نوجوان تو مل جائیں گے جو صائم الدہر بھی ہوں، تہجد گزار بھی ہوں دلایل الخیرات کا بھی ورد رکھتے ہوں، لیکن اس کا یقین کیونکر ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ وہ جذبات شباب سے خالی الذہن ہو کر کر رہے ہیں۔

آپ ایک فطری رسم ادا کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ فطرت سے جنگ بھی کر رہے ہیں۔ عجیب تماشہ ہے۔

بہت زمانہ ہوا جب تھوڑی سی بے اعتدالی اُن سے ہوئی تھی، لیکن جب سے وہ "ہاروت" بنانے والی "زہرہ" غروب ہو چکی ہے، پھر کوئی اور اطلاع اس قسم کی کانوں تک نہیں پہونچی۔ پھر اس سے زیادہ بجھے ہوئے دل کا آدمی آپ کو اور کہاں ملیگا، زیادہ چھان بین نہ کیجئے اور اس فرض سے سبکدوش ہو کر ہجرت کر جائیے۔ تاکہ اس احتساب کے عذاب سے آپ کو نجات ملجائے۔

یہ تم شعر سمجھنا چاہتے ہو یا اس پر جراحی کرتے ہو۔ شاعری نہ اقلیدس کا مقالہ ہے نہ حدیقہ حکیم سنائی کہ "دواء دوچار" کے سے حقایق اس میں نہ پائے جائیں تو درس اخلاق ضرور ہو۔

نقش و نگار سے لطف اُٹھانے کے لئے صرف نگاہ سے کام لینا چاہئے، تم نے اگر اُن کو کُھرچ کر یہ دیکھنا چاہا کہ ان کے پیچھے کیا ہے تو سوائے بے آب و رنگ کاغذ کے اور کیا ملیگا؟

غالب کا یہ شعر کتنا پاکیزہ ہے:۔

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

لیکن اگر تم نے یہ بحث شروع کر دی کہ غالب کانچ گلانے کے فن سے کب واقف تھا، یا یہ کہ اُسوقت بلیماروں میں شیشہ گروں کی دوکانیں کہاں تھیں جہاں انھوں نے آبگینہ کے پگھلوایا ہوگا یا یہ کہ ساغر میں ڈالتے کے بعد کانچ رقیق کیونکر رہا ہوگا کہ پیا جا سکتا، یا یہ کہ اس کے پینے کے بعد کوئی زندہ کیونکر رہ سکتا تھا۔ تو سوائے

اس کے کہ سننے والا اپنا منہ پیٹ لے اور کیا کر سکتا ہے۔

جن اشعار کا تم نے مضحکہ اُڑایا ہے ان سے لطف اُٹھانے کی اہلیت تم میں ہی نہیں۔

ہوتا ہے ازدحام تمنا اسی قدر
ہوتی ہے جتنی دیر کشودِ نقاب میں

اس شعر کے سمجھنے میں تم نے جس بدتمیزی سے "جنسی جذبات" کا تجزیہ کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ تمھاری انتہائی بدذوقی کو ظاہر کرتا ہے، بلکہ فی نفسہٖ "شباب" کی بھی توہین ہے۔

ایک شعر سے لطف اُٹھانے کے لئے شاعر کی "نفسیات" سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو خود اپنے علوئے نفس سے کام لینا چاہئے۔ اور اسے بھی جانے دو میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمنا کا ایک خاص مفہوم قرار دینا اور پھر لفظ "ازدحام" کی چھان بین میں اتنی بدتمیزی کا اظہار۔ اس کا تمھیں کیا حق حاصل تھا، جبکہ "کشودِ نقاب" کی تعیین خود اس کے منافی پڑتی ہے۔

ایک صاحب تم سے بھی زیادہ خوش تمیز یہاں موجود ہیں۔

غالب کا مشہور شعر ہے:-

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

انھوں نے رسوائی اور خلوت کو ملا کر ایک عجیب مفہوم پیدا کیا ہے۔ یعنی شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ اگر خلوت میں آپ نے مجھے بلا لیا تو رسوائی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، کیونکہ دُنیا جانتی ہے میں بالکل ضعیف و ناکارہ ہوں اور کسی کو کچھ شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔

بولو قایل ہوئے کہ نہیں۔ اب آؤ گے تو میں تمھیں انھیں کا شاگرد کرا دوں گا۔ ایسے سخن فہم زمانہ میں شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں۔

میرے عزیز دوست۔

آپ کی داستانِ درد سُنکر سخت تکلیف ہوئی لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ جو شخص مصائب کو خود دعوت دے، اُسے شکوہ و شکایت کا کیا حق حاصل ہے۔

آپ کو یاد ہوگا میں نے پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ دیکھئے اس سے بچئے۔ ایسی مردم فریب صورت یا تو اسوقت نظر آئی تھی جب آدم اس کے مشورہ پر عمل کر کے عدن سے نکالے گئے یا اب اس شخص کو ملی ہو

لیکن آپ نہ مانے اور آخر کار وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔

میں نے ایک شاعر کے متعلق اپنے تصور کو ہمیشہ بہت بلند پایا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اصولاً شاعر سے بہتر اخلاق کسی اور کا نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ بدنصیبی صرف ہندوستان کے حصہ میں آئی ہے کہ جو شخص جتنا اچھا شعر کہتا ہے اتنا ہی زیادہ بداخلاق ہے۔

بہر حال اب بھی کچھ نہیں گیا۔ جرأت سے کام لیکر ان سے صاف صاف کہدیجئے کہ آیندہ مہربانی کی ضرورت نہیں۔ ورنہ سچ کہتا ہوں وقت وہ آنے والا ہے جب آپ خودکشی کے لئے زہر کا پیالہ ہاتھ میں لئے ہوں گے اور وہ دیکھ کر مسکرا رہا ہوگا۔

بہر حال مجھے آیندہ کوئی اطلاع دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں خود سن لوں گا آپ کا کیا حشر ہوا۔

بلیک ڈائمنڈ

ہندوستان کا واحد بے ضرر خضاب

اسوقت بازار میں مختلف ناموں کے خضاب بکثرت نظر آتے ہیں لیکن یہ تمام خضاب ایک ہی چیز ڈایامین سے طیار ہوتے ہیں جو بے انتہا ارزاں چیز ہے، لیکن اس کے استعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند دن کے بعد چہرہ پر آماس آجاتا ہے، نزلہ کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے، جلد پر دانے پڑ کر زخم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور بعض مرتبہ جب اس کا زہر آہستہ آہستہ خون میں پوری طرح سرایت کر جاتا ہے، ہلاکتیں بھی ہو جاتی ہیں، کیونکہ ڈایامین میں نہایت ہی مہلک قسم کا زہر ہے اور صرف چمڑا رنگنے کے کام میں لایا جاتا ہے۔

ہمارا خضاب ڈایامین یا کسی زہریلی چیز سے بالکل پاک ہے اور اس کے استعمال سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ بالوں کو اصلی سیاہ رنگ دیکر ان کی چمک اور مضبوطی کو بھی قایم رکھتا ہے اور جلد پر دھبے نہیں آنے دیتا۔ قیمت علاوہ محصول ایک بکس ۹/- ایک شیشی میں محصول ۶/ صرف ہو جاتا ہے اس لئے جتنی زیادہ شیشیاں طلب کی جائیں گی اتنا ہی فائدہ ہوگا۔

ہر شہر میں ایجنسیاں درکار ہیں ——— کمیشن کے متعلق خط و کتابت کیجئے

کارخانہ خضاب بلیک ڈائمنڈ لکھنؤ

باب الاسئلۃ والمناظرہ

(جناب ابوالکمال امید امیٹھوی)

جیبی ـــــ آپ سے یوں تو تقریبًا روزانہ گفتگو کا موقع ملتا رہا ہے لیکن آج تحریری گفتگو کو جی چاہتا ہے اور ضرورت بھی ہے۔ ممکن تھا کہ جو کہنا چاہتا ہوں آپ سے کسی صحبت میں زبانی کہتا مگر اس خیال سے کہ میں گفتگو شروع کرتا اور کوئی صاحب، تسلیم یا اسلام علیکم کہکر اپنا قصہ شروع کر دیتے اور میں اپنا سا منھ لیکر رہ جاتا اور آپ کا دل و دماغ دوسری طرف بٹ جاتا، پریشان ہو جایا کرتا تھا یہاں تک کہ بہرائچ چلا آیا۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے کہا تھا کہ شاید آپ کی روانگی سے پہلے میں بہرائچ چلا جاؤں۔ اس لئے بغیر ملے ہوئے چلے جانے کا عذر قبول فرمائیے۔

ہاں تو کہنا یہ ہے کہ واقعہ معلومہ کے بعد مجھ ایسے "فرسودہ رسم ہائے عزیزاں فروگزار" کے تحت پر ایک اچھا خاصہ ڈھیر خطوط کا جمع ہو گیا جس کو آپ تعزیت نامہ یا پُرسا کہہ سکتے ہیں ان احباد اعزا کے خطوط میں بجز اس کے کہ "خدا صبر جمیل عطا فرمائے" اور کچھ نہیں ہے اور یہی مہمل جملہ لوگوں سے سُنتے سُنتے تھک گیا ان میں ایک شخص بھی آپ کی طرح۔ "در سور نوحہ خواں نبہ بزم عزا برقص" کا مصداق نہ ملا۔ غرض وحشت برابر بڑھتی گئی خدا انوری صاحب کو زندہ سلامت رکھے جنھوں نے مجھے زبردستی یہاں کھینچ بلایا اور ہر ممکن سامان میرے غم غلط کرنے کا بہم پہونچایا۔ آج کسی قدر میں اپنے آپ کو مطمئن پاتا ہوں اس لئے اپنا مختصر سا واقعہ زندگی بیان کرنے کے بعد آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ کیا بات ہے چونکہ آپ نفسیات کے ماہر ہیں اور میں آپ کا ارادتمند ہوں خدا کے لئے بتائیے کہ لوگوں کو کیا جواب دوں اور اس حالت کو کیا کہوں۔

صاحب ۔ پہلا واقعہ میرے والد کا واقعۂ مرگ ہے ۔ جس کا غم مجھے کافی ہونا چاہیے تھا لیکن یہ وہ زمانہ تھا اور اُس عالم میں تھا کہ خدا بھی یاد نہیں آتا پھر بندہ کا جینا مرنا کیا یعنی میرا شباب اور ایک ایرانی خاتون کی شبانہ روز شریک زندگی کی حیثیت سے صحبت۔ ہاں اب خاتون کی موت کو میری زندگی کا پہلا واقعہ کہئے جس کے بعد خیال کرتا تھا کہ اس سے بڑھکر دوسرا غم نہ ہوگا۔

دوسرا واقعہ ایک ہفتہ کے اندر بعارضہ طاعون میری والدہ کا انتقال اور ۲۲ برس کے بھائی کا مرنا اور بہن کے بارہ برس والے بچے کا انتقال۔

تیسرا واقعہ مولانا عبؔ کا مرنا جو میرے اُستاد اور محب تھے۔

چوتھا واقعہ یوسف علی کا۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب دل پر چوٹ لگتی ہے تو ایک شاعر بہتر سے بہتر شعر کہہ سکتا ہے میں ان واقعات پر ایک مصرع بھی موزوں کرنے کے قابل نہیں رہا۔ جب کوشش کی قلم ہات سے چھوٹ پڑا دماغ مختل ہوگیا۔ حالانکہ اُردو فارسی سیکڑوں تاریخیں میری ان واقعات کے ماسوا موجود ہیں میرا یہ خیال ہے کہ میں نے جن کی تاریخیں لکھی ہیں اُن کا غم صحیح معنوں میں مجھے نہ تھا اور جو کچھ لکھا وہ محض شاعری تھی یا قادر الکلامی آپ بتایئے کہ یہ کیا حالت ہے شاعری کیوں برسرِ کار نہیں آتی۔ کیوں ان واقعات پر قلم نہیں اُٹھتا یہ غم نہیں ہے یا وہ رنج نہیں تھا جس پر زور شاعری صرف کیا گیا۔ احباب کہتے ہیں کہ جو شخص سیکڑوں مادۂ تاریخ نکال چکا ہو وہ بیٹے کے مرنے کی اطلاع نہ دے کیا قہر ہے خدا کے لئے اس کا جواب لکھئے۔

امید صاحب۔ گرامی نامہ بالکل خلافِ امید پہونچا۔ اچھا کیا اس وقت آپ لکھنؤ سے چلے گئے میں خود بھی آپ سے یہی کہنے والا تھا۔ لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لکھنؤ چھوڑنے کو کہوں تو کہاں جانے کا مشورہ دوں۔ — بہرائچ کے اس "مردِ غیب" کا علم نہ تھا۔ بہرحال آپ نے خوب کیا کہ چند دن کے لئے اُس ماحول کو چھوڑ دیا جس کا ایک ایک ذرہ آپ کے لئے "یادگارِ غم" ہے۔

مولانا، غم والم ہو یا مسرت ونشاط، سب اضافی چیزیں ہیں۔ "اضافی" سے مراد یہ کہ وہ خود کوئی مستقل وجود نہیں رکھتیں بلکہ پیدا ہوتی ہیں ان حالات و واقعات سے جن سے ایک شخص ضرورتاً یا فطرتاً متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اسی لئے یہ کیفیتیں گھٹتی بھی ہیں، بڑھتی بھی ہیں، فنا ہوتی ہیں اور پھر اُبھر بھی آتی ہیں۔ کہتے ہیں اگر کوئی شخص کوشش کرکے پتھر کا دل بنالے — اور آپ شاعر ہونے کی حیثیت سے اس کی ترکیب مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے — تو احساسِ غم کم ہوجاتا ہے۔

مگر میں سمجھتا ہوں کہ غم غم میں بھی بڑا فرق ہے۔ غالبؔ نے اس کی صرف دو تقسیمیں کی ہیں:۔ غمِ عشق وغمِ روزگار۔ کیونکہ اس کی زندگی کا انحصار صرف دو تمناؤں پر تھا ایک (صرف برائے گفتن) وہ جسے — "وہ بیار بستر و نورد نہ آغوش"، کا چوچلا کہنا چاہیے۔ اور دوسری (واقعی حقیقی) وہ جو — "جام بدستے وسبوئے بدست"، کی حد تک کُھل کھیلنا چاہتی تھی — ان کے علاوہ اسے کچھ نہ معلوم تھا کہ

دنیا میں "بینوائیاں اور بے برگ و باریاں" کس کس طرح انسان پر مسلط ہوتی ہیں اور ان کی تڑپ میں کتنا فرق پایا جاتا ہے۔

نفسیات کا مشہور مسئلہ ہے کہ جب کسی ناگوار تاثر کے اسباب پیدا ہوتے ہیں تو فطرتِ انسانی ان کو دفع کرنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ اسی کا دوسرا نام "تنکے کا سہارا ڈھونڈھنا" ہے۔ خواہ وہ مستقبل کی امید موہوم ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن چونکہ اس کوشش میں زیادہ تر انسان کی قوت ارادی کام کرتی ہے اور قوتِ ارادی خود ماحول سے متاثر ہونے والی چیز ہے، اس لئے کوئی کلیہ قاعدہ اس باب میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ "ہر کارے و ہر مردے" تو آپ نے سنا ہی ہوگا، اگر اعمالِ نفس و ارادہ کو بھی "کام" میں شامل کر لیا جائے تو یہ فقرہ پوری طرح اس نفسیاتی نظریہ پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ خود اپنے ہی حالات کو ملاحظہ فرمائیے۔

جب آپ کے والد کا انتقال ہوا تو آپ نہ صرف یہ کہ جوان تھے، بلکہ جیسا آپ خود لکھتے ہیں، پوری طرح دادِ جوانی دے رہے تھے۔ اس لئے اس کا احساس قدرتاً آپ کو بہت کم ہونا چاہئے تھا۔ البتہ ایرانی رفیقِ حیات کی موت کا غم لازم تھا کیونکہ آپ کی تمام کارگاہِ نشاط اس پر منحصر تھی، لیکن اس کا دیر پا رہنا بھی ممکن نہ تھا کیونکہ اس کی مقاومت کے لئے آپ کے پاس اگر اور ذرائع موجود نہ ہوتے تو بھی آپ کا شباب ہی کافی تھا جس سے زیادہ حیلہ جو چیز کاروبارِ محبت میں اور کوئی نہیں۔

اس کے بعد والدہ، بھائی اور بھانجے کا یکے بعد دیگرے ایک ہفتہ کے اندر انتقال کر جانا اور آپ کے استاد مولانا رُعب کا جدا ہو جانا۔ سو اس میں کلام نہیں کہ یہ تمام واقعات و حادثات دل ہلا دینے والے تھے لیکن چونکہ اسوقت آپ کی عمر اور خود آپ کے ذاتی حالات "ضبط و تحمل" کے اسباب سے معرا نہ تھے اس لئے انھیں بھی جھیل گئے۔ اب کہ آخر وقت میں دل و دماغ بھی جواب دے چکے ہیں اور شکستہ ناخنی نے آیندہ گرہ کشائی کی اُمید بھی باقی نہیں رکھی، جوان بیٹے کی موت پر آپ کا اسدرجہ متاثر ہونا بالکل قدرتی بات ہے لیکن "چارۂ بیداد" نہ آج تک کسی کی سمجھ میں آیا ہے نہ آئے گا۔

آپ تو خیر مرد ہیں اور بحمداللہ کسی کے محتاج بھی نہیں۔ اس کو آپ کیا کہیں گے کہ ایک محتاج بڑھیا کا اکلوتا جوان بیٹا دو وقت کے فاقوں کے بعد لکڑی کا گٹھا بیچکر گھر واپس آتا ہے کہ اپنی ضعیف ماں کی فاقہ شکنی کا سامان فراہم کرے اور ٹھیک اسوقت جبکہ وہ اس کا انتظار کر رہی ہے ایک شخص یہ خبر آکر سناتا ہے کہ "تیرے بیٹے کو تو سانپ نے ڈس لیا"۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ قدرت اس سے زیادہ اور کیا سخت صورت "شکر و شکایت" کے سدباب کی اختیار کر سکتی ہے۔ لیکن مذہب کے اس فیصلہ کو ملاحظہ فرمائیے کہ ٹھنڈا پانی پینے کے بعد "الحمدللہ" کہنا تو واجب اور

جب دل وجان کی ٹھنڈک چھین لیجائے تو شکایت کرنا کفر۔

الغرض میرے نزدیک شکر وشکایت دونوں لغو ہیں۔ آپ نے اگر ایرانی خاتون کی معیت کا زمانہ بغیر شکر کے بسر کردیا تھا تو اب "یوسف" کی گم گشتگی پر بھی شکایت نہ کیجئے۔ نہ ادائے شکر سے اُس خاتون کی عمر بڑھ سکتی تھی، اور نہ شکایت سے اب آپ کا اُجڑا ہوا دل دوبارہ آباد ہو سکتا ہے۔ قدرت کے ناخن وچنگال دونوں خون سے رنگین ہیں اور اپنا یہی "بھاؤ" اسے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہم آپ کیا کر سکتے ہیں۔ اگر آپ نے دوسرے دل کے واقعات مسرت وغم پر سیکڑوں تاریخیں کہہ ڈالیں اور خود "اپنی بیتی" پر آپ کے دماغ نے کام نہ دیا تو حیرت نہ کرنا چاہئے، کیونکہ تاریخگوئی صنایع وبدایع کی ایک قسم ہے جس کا تعلق جذبات وتاثرات سے نہیں ہے۔ آپ کسی اور کے حادثہ پر تو تاریخگوئی کی موشگافیوں میں پڑ سکتے ہیں، لیکن اپنے صدمات پر یہ تصنع وتکلف بالکل خلاف فطرت ہے۔ ایسی حالت میں ایک شاعر مرثیہ تو لکھ سکتا ہے لیکن ریاضی کی مشق نہیں کرسکتا۔

پھر آپ کی شاعری جس ذوق سے متعلق ہے وہ مرثیہ گوئی کے بھی منافی پڑتی ہے۔ آپ کا فطری میلان شوخی ورنگینی کی طرف ہے، اس لئے یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ غم میں بھی کوئی پہلو لطف وانبساط کا پیدا کرلیں، لیکن آپ اپنے "آنسو بہانے" کو صرف "رونا" ہی کہیں گے، "آبشار غم" جاری کرنا نہیں کہہ سکتے۔

ایسے ذوق والوں کا تاثر الم ہمیشہ "غم سادج" ہوا کرتا ہے اور حقیقی غم یہی ہے۔ جو غم "شاعری" کی طرف مایل کرسکے وہ غم نہیں ہے بلکہ صرف شاعری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت آپ اس واقعہ کی بھی تاریخ لکھیں لیکن یہ اسوقت ممکن ہوگا جب امتداد زمانہ اس کی تلخی کو کم کردیگا۔ فی الحال تو آپ کے آنسو "دُرِ منثور" ہی رہیں گے، خواہ آپ کچھ ہی کریں۔

(جناب ابوالکمال امید امیٹھوی)

جیبی۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو ۔۔۔ جو مے ونغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں ۔ غالب

مطلب صاف ہے کہ مے ونغمہ دونوں اندوہ رُبا نہیں ہیں اور جو لوگ اس کے خلاف قایل ہیں وہ اگلے وقت کے لوگ ہیں غرض میں بھی اس سے متفق ہوں (کہ نغمہ اندوہ رُبا نہیں) بلکہ اندوہ فزا ہے کیونکہ اس کا تجربہ مجھے کافی آج کل انوری صاحب کی وجہ سے ہوا جو میرے دل بہلانے اور غم غلط کرنے کے لئے ہر ممکن طریقہ سے کوشاں ہیں باقی رہی شراب تو اس کا تجربہ نہیں اور شاید عمر بھر کبھی نہ ہو سکے کہ یہ کیونکر اندوہ ربا نہیں ہوتی حالانکہ اگلے وقت کے لوگ نہیں بلکہ حال کے لوگ اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں۔ غالب

زندہ نہیں پوچھوں تو کس سے پوچھوں۔ آپ سے پوچھتے ہوئے ڈرتا ہوں کہیں آپ کچھ اور خیال نہ کریں اور مجھے اپنے گمان سے شرمندہ ہونا پڑے۔ لیکن واردات قلب کا چھپانا اور پھر آپ ایسے پیر طریقت سے جس کا ہر ارشاد قلب و روح کو پیام صبر و سکون دیتا ہو کیونکر ممکن تھا، کیا آپ زحمت فرمائیں گے کہ اس کا بھی جواب نگار میں کسی طریقہ سے دیں۔ مکتوبات نیاز کے متعلق آپ کے بعض کوتہ اندیش احباب کی رائے ہے کہ وہ اکثر فرضی ہیں، میں ان باتوں کے جوابات پر آپ کو ابھار کر کے اُن کو جھٹلانا چاہتا ہوں حالانکہ آپ بخدا اس سے بے نیاز اور بالاتر ہیں۔

حضرت — اندوہ ربائی یا اندوہ فزائی کا تعلق صرف اپنے حال سے ہے۔ مے و نغمہ میں یہ سلیقہ کہاں کہ وہ کسی کو مسرور یا مغموم بنا سکیں۔ اگر اپنا دل مسرور و مطمئن ہے تو میر انیس کے شیون کو بھی سنکر رگ انتقاد جنبش میں آجاتی ہے، ورنہ حافظ کے "بیار بادہ" پر بھی رونے ہی کو جی چاہتا ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ نغمہ کی ترکیب میں عنصر غالب "اندوہگینی" ہی کا ہے اور جب تک "دلی گداختگی" کی کیفیت پیدا نہ کی جائے ہم اس کی حقیقی روح تک نہیں پہونچ سکتے۔ شراب کے متعلق، شراب پینے والے کہتے ہیں "وہ اسی کیفیت کو بڑھا دیتی ہے جس میں اس کا استعمال کیا گیا ہے" لیکن میں اس نظریہ کا قایل نہیں، شراب واقعی اندوہ رُبا ہے اور غم غلط کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ خاصکر ہماری آپ کی عمر میں کہ اسوقت تو یہ (بہ فتوائے شیخ بوعلی سینا) آب حیات سے کم نہیں۔

غالب کا شراب کو "اندوہ فزا" کہنا کوئی سند نہیں کیونکہ وہ شراب پیتا تھا اور ہمیشہ اس "دھڑکے" کے ساتھ کہ مبادا پھر ہاتھ نہ آئے۔ اس لئے اس کا رنج و ملال بالکل درست و بجا تھا۔ آپ انوری صاحب کے پاس ہیں (خانۂ انوری میں نہیں) اس لئے کسی بلائے آسمانی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، پیکر دیکھئے — عذاب و ثواب میری گردن پر۔

میرے مکتوبات کے متعلق یہ خیال ظاہر کرنا کہ وہ فرضی ہیں، بالکل ایسا ہی ہے جیسے (بلا تشبیہ) قرآن پاک کی آیات کے متعلق اس بحث میں پڑ جانا کہ یہ کس کے حق میں نازل ہوئی ہیں اور اصل آیات کے مفہوم کو پس پشت ڈال دینا۔

میرے مکتوبات کے مخاطب فرضی ہوں یا اصلی، لیکن بہر حال ہیں وہ میرے ہی لکھے ہوئے۔ اس قسم کی بحث چھیڑنے والے وہی ہیں جو اس رنگ میں لکھنے کے لئے بیتاب ہیں، لیکن لکھنے سے معذور۔ سو اعتراف عجز کی بہت سی صورتیں ہوا کرتی ہیں اور انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

باب الاستفسار

اُردو زبان اور عربی و فارسی الفاظ کا استعمال

(جناب مرزا غفور بیگ صاحب۔ پونا)

اسوقت اُردو ہندی کے جھگڑے میں اکثر حضرات کا خیال ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اُردو کو عربی و فارسی الفاظ کے بار سے ہلکا کیا جائے، لیکن آپ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس تحریک کے موافق نہیں۔ سنا ہے کہ ترکی میں بھی یہی کوشش کی جارہی ہے کہ غیر زبان کے الفاظ خارج کر دئے جائیں اور ایران بھی یہی کر رہا ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کی پیروی نہ کریں۔ براہ کرم ذرا تفصیل سے لکھئے کہ آپ کی کیا رائے ہے۔

(نگار) جس طرح ایک قوم کے لئے اس سے زیادہ باعث ننگ امر اور کوئی نہیں کہ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی میں اجنبی اقوام کی محتاج ہو، اسی طرح ایک زبان کے لئے یقیناً یہ امر حد درجہ شرمناک ہے کہ وہ اظہار مدعا میں دوسری زبانوں کی دست نگر ہو۔ اس لئے اصولاً میں نے کبھی اس کی حمایت نہیں کی کہ اُردو کو خواہ مخواہ عربی و فارسی الفاظ سے گرانبار کیا جائے، لیکن چونکہ عملاً یہ ممکن نہیں ہے اس لئے میں اس کوشش کو عبث خیال کرتا ہوں۔

اُردو زبان کی تخلیق و تشکیل سے آپ بھی واقف ہوں گے کہ اسکی ترکیب میں بہت بڑا عنصر عربی و فارسی الفاظ کا شامل ہے اور اس لئے اگر آپ ان کو علٰحدہ کریں گے تو ظاہر ہے کہ ان کی جگہ دوسرے الفاظ سے پُر کریں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ الفاظ کہاں سے لائیں گے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو آپ نئے الفاظ اختراع کریں جو ممکن نہیں ہے، یا پھر لامحالہ سنسکرت سے مدد لیں جیسا کہ ہندو آجکل کر رہے ہیں۔ میں اس کو گناہ نہیں سمجھتا کہ عربی و فارسی الفاظ ترک کر کے سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے جائیں،

یکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ رسم خط بھی وہی اختیار کیا جائے۔ پھر اگر مسلمان اس کے لئے
مادہ ہوجائیں تو اس میں شک نہیں کہ آپس کی یہ بڑی تفریق مٹ جائے اور زبان کی موجودہ نزاع جو مذہبی نزاع
کے بعد سب سے زیادہ تباہ کن نزاع ہے ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا
ونا ممکن نہیں اور اس لئے عربی و فارسی الفاظ کی مخالفت سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتی کہ آپ اپنی
زبان کی وسعت کو کم کرتے جارہے ہیں اور اردو کو بجائے علمی زبان بنانے کے صرف قصے کہانیوں کی زبان
ناناچاہتے ہیں۔

زبان ایک قوم کی تمدنی و ذہنی خصوصیات کا آئینہ ہوا کرتی ہے اور اس کے مخصوص کلچر سے متاثر ہوکر
یک مخصوص صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اس لئے اردو زبان۔ وہی زبان جس میں عربی و فارسی کے الفاظ
پ کو زیادہ ملتے ہیں۔ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت، مسلمانوں کے قومی و مذہبی جذبات اور مسلمانوں کے
مدنی رجحانات سے پیدا ہوئی ہے اور اس میں عربی و فارسی کا ہر ہر لفظ اُن کے مخصوص ذوق کی نمایندگی
رنے والا ہے، اس لئے ان کو نکال دینے کے معنے صرف یہ ہیں کہ آپ قوم کو گونگا بنا دینا چاہتے ہیں اور اسکے
روبال نوچکر پھینک دینا پسند کرتے ہیں۔

اگر آج مسلمان عربی و فارسی الفاظ ترک کرکے سنسکرت کے الفاظ اختیار کرنے پر آمادہ ہو بھی جائیں تو
س کے معنے یہ ہیں کہ پہلے وہ اپنے تمام اس لٹریچر کو جو ان کی صدیوں کی تہذیب و ثقافت کا نتیجہ ہے دریابرد
ردیں اور پھر کسی پاٹ شالہ میں جاکر "کاکھا۔ گاگھا" سیکھنا شروع کریں۔

اُردو زبان اپنی تمام موجودہ خصوصیات کے ساتھ ایک مستقل رکارڈ ہے، مسلمانوں کی مذہبی روایات کا، تاریخی
واقعات کا، تمدنی خصوصیات کا، رسم و رواج کا اور اُن کی روایت و درایت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اسمیں
محفوظ نہ ہو۔ پیدائش سے لیکر جب کان میں اذان دیجاتی ہے، نزع کے وقت تک جب سورہ یاسین سنائی
جاتی ہے، مسلمانوں کا تعلق عربی و فارسی الفاظ سے ایک ایسا غیر منقطع تعلق ہے کہ ہم اس کو علحدہ کرکے اپنے
قومی وجود کو قایم رکھ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے ہندو مسلمانوں میں یک جہتی کے پیدا کرنے کی غرض سے اردو
زبان میں یہ تغیر پیدا کرنا، یقیناً پاکیزہ خیال ہے، لیکن یکسر طلب محال۔ کیونکہ ان دونوں کے اختلاف کا
حقیقی سرچشمہ صرف مذہب ہے اور جب تک یہ ایک دوسرے کو کافر و ملکش سمجھنا ترک نہ کریں گے
حض زبان و رسم خط کی تبدیلی کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکتی۔ اس لئے میری رائے میں صحیح راستہ
وشش کا وہ نہیں ہے جو اختیار کیا جارہا ہے بلکہ دوسرا ہے جس میں قدم رکھتے ہوئے ہندو مسلمان
دونوں ڈرتے ہیں۔

بعض حضرات اس سلسلہ میں یہ بھی کہہ اُٹھتے ہیں کہ اگر مسلمان اپنا کلچر ترک کرکے ہندوؤں کا کلچر اختیار کرلیں تو کیا حرج ہے جبکہ ہندوستانی نژاد ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے وہی تہذیب زیادہ مناسب ہے جو ہندوؤں کی ہے۔ لیکن ایسا مشورہ دینے والے حضرات یہ غور نہیں کرتے کہ کسی قوم کی تہذیب و معاشرت ایک دن میں طیار نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں اور ایک جُگ گزرنے کے بعد اس کا ذوق پختہ ہوتا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ مسلمان کوشش کرنے کے بعد بھی اس میں کامیاب ہوجائیں۔ میرے ایک مسلمان دوست کوشش کرکے کامل بیس سال تک سبزی خور بنے رہے لیکن آخر کار اکیسویں سال بھُنے ہوئے گوشت کی خوشبو کی تاب وہ نہ لاسکے اور جیسے ملکش پہلے تھے ویسے ہی پھر ہو گئے۔ یہ بظاہر ایک نہایت معمولی بات ہے لیکن اس پر ان تمام خصوصیات ذوق کا قیاس کیجئے جو مسلمانوں کو ہندوؤں سے متمایز کرنے والی ہیں اور جن کو مٹانے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔

قارئین نگار اچھی طرح واقف ہیں کہ میں مذہبی اختلاف کو نوعِ انسانی کے لئے بدترین لعنت سمجھتا ہوں اور میرے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر اور کوئی نہیں کہ ہندو مسلمان مسایل مذہبی میں اختلاف رکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو بُرا سمجھیں اسی لئے اگر آج دنیا کے تمام مذاہب مٹ جائیں (جو زمانۂ قدیم سے لیکر اسوقت تک استخوانِ جنگ بنے ہوئے ہیں) تو میں اس کو نوعِ انسانی کی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ لیکن خصوصیات قومی کو میں خصوصیات مذہبی سے زیادہ ضروری سمجھتا ہوں اور ان کے مٹانے کی تائید کبھی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اسوقت ایک جماعت صرف "قومیات" ہی کے اصول پر زندہ رہ سکتی ہے اور اس کی زندگی یہی ہے کہ وہ اپنی تہذیب کو قایم رکھے۔ بہر حال اُردو زبان سے عربی و فارسی الفاظ کو نکالنا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ اس میں ہندی و سنسکرت کے درخور کو تسلیم کیا جائے اور میں اسے قومی حیثیت سے مسلمانوں کی موت سمجھتا ہوں۔ رضا شاہ اور کمال اتاترک بیشک فارسی اور ترکی زبان سے اجنبی الفاظ نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن مجھے اس میں کلام ہے کہ وہ عربی و فارسی کے الفاظ علٰحدہ کرنے میں کامیاب ہونگے کیونکہ دونوں زبانوں میں نصف سے زیادہ عربی و فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں اور تاوقتیکہ وہ سرے سے اپنی زبان ہی کو نہ بدلدیں اس میں کامیابی محال ہے۔ افسوس ہے کہ اس عہد کے ترکی لٹریچر کا کوئی نمونہ میرے پاس موجود نہیں ورنہ میں شاید اپنی تائید میں مثالیں بھی پیش کرسکتا۔ لیکن اسوقت کا ایرانی لٹریچر آپ کے سامنے موجود ہے اسے دیکھئے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ رضا شاہ کس حد تک اس میں کامیاب ہوئے یا ہو سکتے ہیں۔

ایران میں ایک مجلس جدید فرہنگ مرتب کرنے کے لئے قایم ہوئی ہے اور اس نے بعض اصطلاحات قا

کو جدید فارسی کے قالب میں ڈھالا[1] ہے، لیکن زبان جس چیز کا نام ہے وہ نصف سے زیادہ عربی الفاظ پر مشتمل ہے۔

اسی سال جب رضا شاہ پہلوی ایران کی جدید یونیورسٹی کے سالانہ جلسہ میں تشریف لے گئے تو وہاں نوجوانان ایران کے سامنے ایک تقریر فرمائی جسکے جستہ جستہ فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں :-

"دو مطلب را می خواہم بفرزندگان خود گوشزد نمایم - اولاً باید دانش آموز با ہمیشہ در صدد ترقی و تعالی خود باشند۔ زیرا سعادتِ افراد ست کہ سعادتِ جامعہ را فراہم می کند..... بہ شما فرزندان خود می گویم کہ علاقہ بہ مملکت را باید بواسطہ سعی و عملی کہ بہ آزادی و استقلال کشور شماست، نسبت بہ میہن خود صمیمی باشد و عواطفِ صمیمیت شما بہ میہن خود تاں باید مافوق تمام عواطف و احساسات باشد"

اب ملاحظہ فرمائیے کہ ان چند فقروں میں سے زیادہ عربی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور بعض اتنے ثقیل ہیں کہ اُردو میں عام طور پر رائج بھی نہیں ہیں ---- اسی سلسلہ میں طالبات کی طرف سے بھی ملکہ ایران کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا گیا تھا اور اسکے جواب میں علیا حضرت نے جو کچھ فرمایا اس کی زبان بھی دیکھ لیجئے :-

"بے نہایت مسرور م کہ می بینم خانمہا در نتیجہ دانائی و معرفت بوضعیت خود آشنا شدہ و پے بہ حقوق و مزایائے خود بردہ اند..... من معتقدم کہ برائے سعادت و ترقی ایں مملکت باید ہمہ از صمیم قلب کار کنیم"

یہ ہے وہ جدید ایرانی زبان جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عربی سے بیگانہ ہوتی جاتی ہے -- اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیں کہ ترکی و ایران اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو بھی ہندوستان کے لئے بطور مثال اس کو پیش کرنا درست نہیں، کیونکہ وہاں مسلمانوں کی حکومت خود اپنی ہے اور وہ جو تغیر چاہیں آسانی سے پیدا کر سکتے ہیں۔ یہاں مسلمان محکوم ہیں، مغلوب ہیں اور اگر انھوں نے اپنی خصوصیات قومی کو قایم رکھنے میں ذرا بھی تساہل سے کام لیا یا کچھ بھی رواداری برتی تو پھر اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی رہی سہی اجتماعیت کو بھی کھو بیٹھیں اور خود اپنے ہاتھ سے اپنی دوامی غلامی کے کاغذات پر مہر توثیق ثبت کر دیں۔

---

[1] بعض اصطلاحیں ملاحظہ ہوں :-

قدیم	جدید	قدیم	جدید
مملکت	کشور	ملاح	ملوان
وطن	میہن	تحت البحری	زیر دریائی
ارتش	قشون	مدرسہ	دانشگاہ - دبستان - آموزشگاہ
ہنگ	فوج	ادارۂ نظمیہ	ادارۂ شاہبانی
امیر لشکر	سر لشکر	محبس	زندان
سلطان	سردان	محبوس	زندانی
بحریہ	نیروئے دریائی	تذکرہ (یا پاسپورٹ)	گزرنامہ
		تفتیش	دارسی - بازرسی

مُفلِس کی دُنیا

قضارا ایسی دنیا میں ہوا اکدن گزر میرا   کہ جس کی یاد سے مجروح ہے اب تک جگر میرا
جہاں کی سرزمیں ذلت جہاں کا آسماں پستی   جہاں کے وادی و کہسار افلاس و تہی دستی
جہاں چاروں طرف مایوسیوں کی حکمرانی ہے   جہاں ہر صورتِ امید نومیدی کی بانی ہے
جہاں حدِ نظر تک رنج و غم کے پُرخطر بَن ہیں   جہاں کے طائرِ رنگیں بولیاں بھی آہ و شیون ہیں
جہاں کا ذرہ ذرہ دعوتِ آلام دیتا ہے   جہاں کا چپہ چپہ دوزخوں کا کام دیتا ہے
جہاں کی صبح درد و رنج کی تمہید ہوتی ہے   جہاں کی شام یکسر دشمنِ امید ہوتی ہے
جہاں کی چاندنی تاریک اور مغموم ہوتی ہے   جہاں کی دھوپ ہمت سوز اور مسموم ہوتی ہے
جہاں ہے ایک ہی مفہوم مرگ و زندگانی کا   جہاں دن دوپہر ڈھل جاتا ہے سورج جوانی کا
جہاں دن رات سر پکڑے ہوئے تدبیر روتی ہے   جہاں آٹھوں پہر آرام سے تقدیر سوتی ہے
جہاں رہ جاتی ہے مفلوج ہو کر جرأت و ہمت   جہاں ہر سو پڑی دم توڑتی ہے روحِ حمیت
جہاں ہر شوق ہو جاتا ہے صرفِ فاقہ بدمستی   جہاں ہر ولولہ ہو جاتا ہے رہنِ تہی دستی
جہاں جوشِ اولوالعزمی کی سانسیں ٹوٹ جاتی ہیں   جہاں احساسِ خودداری کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں
جہاں صدق و صفا کا خون پی لیتی ہے ناداری   جہاں صبر و رضا ہو جاتے ہیں مجبورِ غداری
جہاں بے جرمیاں بھی جرم کا قالب بدلتی ہیں   جہاں آزادیاں بھی قید کے سانچے میں ڈھلتی ہیں
جہاں نشو و نما پاتے ہیں چوری، جھوٹ، عیاری   جہاں پروان چڑھتی ہے خیانت، حرص و مکاری

جہاں ہر ہر قدم پر پائے ایماں ڈگمگاتے ہیں
جہاں کے خوف سے نبیوں کے دل بھی تھرتھراتے ہیں

یہیں بستے ہیں ننگِ زندگی وہ پیٹ کے مارے
جنھیں ہر وقت دن کو بھی دکھائی دیتے ہیں تارے

زمانے بھر کے دُھتکارے خدائی بھر کے ٹھکرائے
ذلیل و خوار - اپنی ہستیوں سے آپ شرمائے

مُجسّم آہ، سرتاپا زبانِ حال کے نالے
فلک کی آنکھ کے ناسور - قلبِ دہر کے چھالے

غلامی کی حیاتِ تیرہ کی تابندہ تصویریں
فنائے عزم و مرگِ ارتقا کی زندہ تصویریں

قتیلِ جہل و پستی، کشتۂ اوہام و نادانی
امیروں کے سگِ ایواں، مگر از قسمِ انسانی

سنانِ جبر اور شمشیرِ استبداد کے گھائل
خدا کیا؟ مالداروں کی خداوندی کے بھی قائل

تموّل جن کو یکسر پیکرِ بیجاں سمجھتا ہے
تمدن جن کو اک انساں نما حیواں سمجھتا ہے

فقط اک خشک روٹی جنکے جسم و جاں کی قیمت ہے
فقط اک حکم جنکے مذہب و ایماں کی قیمت ہے

مشیئت کھیلتی ہے رات دن جذبات سے جنکے
تمسخر کرتی ہے تقدیر احساسات سے جنکے

ہوا کرتی ہیں سامانِ تفریح عصمتیں جن کی
رہا کرتی ہیں برگشتہ ہمیشہ قسمتیں جن کی

ارادوں پر بھی غالب جنکے غیروں کا ارادہ ہے
نہ جنکی اپنی مرضی ہے نہ جن کا اپنا منشا ہے

دبے ہیں جن کے جوہر اسقدر زنگِ مذلت میں
کہ شک ہونے لگا ہے خود جنھیں اپنی شرافت میں

ہے بس لے دیکے جنکی کائناتِ زندگی ساری
غلامی، مفلسی، فاقہ، مصیبت، بھیک، بیماری

جنھیں انساں کہتے آدمیت ہچکچاتی ہے
جنھیں زندہ سمجھتے زندگی کو شرم آتی ہے

فضائے بحر و بر کون و مکاں کو عار ہے جن سے
اجل کو جن سے نفرت زندگی بیزار ہے جن سے

کوئی غمخوار ہے جن کا نہ کوئی پوچھنے والا
خداوندا - الٰہا - داورا - اے دادرس مولا

تمکین، سرمست

محبت کے دو باغی

(۱)

آج دیوالی کی شب ہے، رنگِ شب صد رنگ ہے — چشم خیرہ، ہوش حیراں، شادمانی دنگ ہے
لالہ زاروں سے سوا خوش رنگ دیوالی کی رات — دیدنی ہے آج قندیلوں کی سڑکوں پر برات
جلوہ ہائے حسن کیف و رنگ کے ساماں لئے — قمقمے، فانوس، برقی روشنی، شمعیں، دئے
ہر طرف نظروں کے جھولوں میں شعاعوں کا ہجوم — جیسے کاشی میں اُتر کر آئے ہوں ماہ و نجوم
ہر طرف گانا بجانا اور دوالی کی رسوم — ہر طرف جلووں کی بارش ہر طرف نغموں کی دھوم
آج کی شب میری قسمت بھی ہے کیسی کامگار — میری نظروں میں سمٹ آئی ہے کاشی کی بہار
آج کی شب جشن میں شیاما بھی میرے پاس ہے — کامراں ہیں آرزوئیں شادماں احساس ہے

(۲)

"اے مری دیوی، مری پیاری، مری وجہ حیات! — زبدۂ تخلیق فطرت، نوبہار کائنات!
میری شیاما، میری دنیائے خوشی کی تاجدار — میری تنویر جوانی کی درخشاں یادگار
آ تجھے میں اپنے سینے سے لگا لوں چوم کر — اور پھر ہو جاؤں فکرِ دو جہاں سے بےخبر
تو بھی جوشِ کامیابی میں خوشی کی سانس لے — بادۂ لطف و محبت خود بھی پی مجھکو بھی دے
ہیں! یہ کیا تو رو رہی ہے میری پیاری، سر اُٹھا — کچھ تو منھ سے بول ظالم ہو گیا ہے تجھ کو کیا"

(۳)

"کیا سناؤں اپنی بپتی، کیا بتاؤں اپنا حال — کیا ہنسوں، کیا مسکراؤں، ہر خوشی ہے پائمال

آج تک میں دھرم کے آداب سے مجبور تھی
آرزوؤں کو سلا کر، میں خوشی سے دور تھی

پاک جذبے دل کے لیکن رنگ لاتے ہیں ضرور
پاؤں وہم و رسم کے ہاں ڈگمگاتے ہیں ضرور

عاشقی میں مذہب و ملت کا کیسا امتیاز
ایک ہی ہیں عشق کے مسلک میں پوجا اور نماز

منہ کے بل گرنا ہی پڑتا ہے یہاں ہر رسم کو
ٹھوکریں کھانا ہی پڑتی ہیں سماجی نظم کو،

کس سے کہہ سکتی تھی میں مایوسیوں کی داستاں
کون تھا گھر میں مرے، میرے غموں کا رازداں

مختصر یہ ہے کہ میں آئی ہوں سب کو چھوڑ کر،
توڑ کر اس ملک کی پابندیوں کو توڑ کر،

آیئے پھر کیوں نہ آخر ایسی بازی کھیلئے
جس سے دونوں ایک ہو جائیں ہمیشہ کیلئے

آیئے ملکر نکالیں اک نئی راہِ عمل
جس پہ نازاں ہو محبت، جس سے شرمائے اجل

پیجیئے یہ جام صہبا لیجئے شیاما کا نام
زہر ہے گو اس میں، لیکن زہر ہے امن دوام

لایئے میں بھی پیوں اور شکر کا سجدہ کروں
جی میں ہے اب تو یہی پیکر مروں، مرکر جیوں

(۴)

پی لیا میں نے بھی ہنسکر سم قاتل پی لیا
جی لیا میں، جسقدر جینا تھا مجھ کو جی لیا

ہو کے ہم آغوش دونوں ہو گئے پھر بیخبر
کر رہا تھا زہر بھی ادراک پر پورا اثر

بھولی بھٹکی ہر نظر تھی، دھندلا دھندلا ہر خیال
بے خبر عشق و محبت، بے اثر حسن و جمال

یک بیک بیہوشیوں میں روح نو پیدا ہوئی
دفعتاً احساس میں بجلی کی رو پیدا ہوئی

پھر تخیل کی پری اُڑکر ہوئی سایہ فگن
جس طرف دیکھا نظر آیا محبت کا چمن

روح جاگی مادیت سے اُبھرنے کے لئے
اُڑ گئے دونوں فضا میں سیر کرنے کے لئے

آخرش پورا ہوا حسن تخیل کا سراغ
ہم جو پہونچے باغ نو میں عرش پر پہونچا دماغ

اک نوید مرحبا آئی صدائے غیب سے
اک نئی جنت ہوئی پیدا فضائے غیب سے

فطرت واسطی

[illegible]

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دُنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔

قیمت تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعۂ استفسار و جواب دو جلد

ان دونوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۲۹ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائکلوپیڈیا کی ہے۔ قیمت فی جلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایکروپیہ کم۔

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲/)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳/) کم۔

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲۔ مادئین کا مذہب۔

۳۔ حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴/) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰/)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲/) کم

فراست الید

مؤلفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری۔ شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴/) کم

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲/)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳/) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اُردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عگر)

علاوہ محصول

SHAHI

REG.

BEST TONIC FOR GENERAL DEBILITY

SPECIFIC FOR :-
anaemia,
asthma,
tuberculosis,
& female troubles.

جملہ اقسام کے یونانی مرکبات
صحیح اور پورے اوزان
سے تیار شدہ حاصل کرنا
چاہتے ہیں تو

فہرست دواخانہ

مُفت طلب فرماویں

دماغی اور اعصابی کمزوری

کے لئے "شاہی" لاجواب اور دماغی کام کرنے والے اصحاب کے لئے بے نظیر تحفہ ہے۔
خون کی کمی (انیمیا) کو دفع کرنے اور خون کی افزائش کے لئے "شاہی" کو دنیا کی تمام ادویات پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ افزائش خون کے تمام اجزا اس میں موجود ہیں۔
دمہ وکھانسی اور سل ودق کے لئے نہایت مفید ہے۔
عورتوں کے جملہ امراض ہسٹریا (اختناق الرحم) لیوکوریا (سیلان الرحم) عام جسمانی کمزوری کے دفع کرنے میں "شاہی" بیحد مفید ثابت ہوئی ہے۔

مزید معلومات کے لئے مفت رنگین رسالہ مفت طلب کریں

طبی دواخانہ یونانی

چوک بازار اندور شہر
تار کا پتہ "شاہی" اندور

۶۶ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳
ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۰۳